قیمت : -/10 روپے

جون 2005

ماہنامہ

# اردو دنیا

نئی دہلی

صدر جمہوریہ ہند عالی جناب ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام کی خودنوشت سوانح "ونگس آف فائر" کا اردو ترجمہ "پرواز" کے نام سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے شائع کیا ہے۔ اس کا Audio Version ممتاز فلم ہدایت کار، شاعر اور ادیب جناب گلزار نے تیار کیا ہے۔ صدر جمہوریہ کو یہ کتاب قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے 18/اپریل 2005 کو پیش کی۔ تصویر میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام کے ساتھ جناب گلزار اور جناب شمس الرحمٰن فاروقی۔ تصویر میں جناب ارون تیواری کو بھی دیکھا جا سکتا ہے جن کا تعاون کتاب کی تسوید و تکمیل میں شامل رہا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

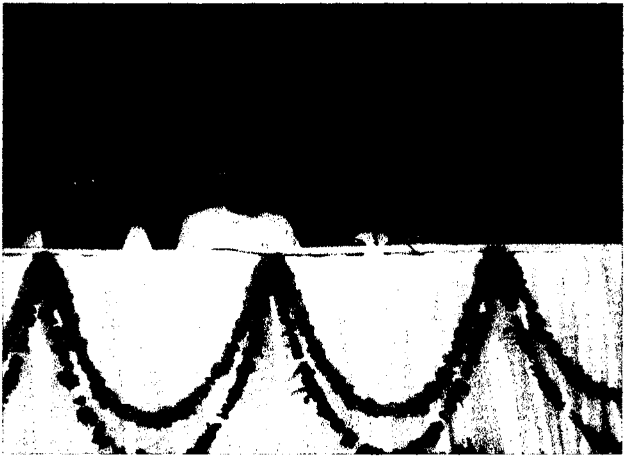

ہندوستانی مشترکہ تہذیب اور سیکولر روایات کے فروغ میں مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ (چیئرمین قومی اردو کونسل) کی خدمات کی نصف صدی اور ان کے 75 ویں یوم پیدائش کے سال میں ''امرت مہوتسو پرو'' 27/اپریل 2005 کو سری فورٹ آڈیٹوریم، نئی دہلی میں منایا گیا جس میں مقتدر شخصیات نے شرکت کی اور وزیر موصوف کو مبارکباد پیش کی۔ تصویر میں (بائیں سے) وزیر اعظم جناب منموہن سنگھ، لوک سبھا اسپیکر جناب سومناتھ چٹرجی، چیئرپرسن متحدہ ترقی پسند محاذ اور کانگریس صدر محترمہ سونیا گاندھی اور جناب ارجن سنگھ کو دیکھا جا سکتا ہے۔

قومی اردو کونسل کی کمیٹی آن ٹیکنیکل ایجوکیشن کا اٹھارھواں اجلاس 4/مئی 2005 کو انڈیا انٹرنیشنل سینٹر، نئی دہلی میں کمیٹی کے چیئرمین جناب گوہر رضا کی صدارت میں منعقد ہوا۔
تصویر میں جناب شمس الرحمن فاروقی وائس چیئرمین قومی اردو کونسل، جناب گوہر رضا، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ ڈائرکٹر قومی اردو کونسل، ڈاکٹر آبشار عالم ڈیپارٹمنٹ آف کمپیوٹر سائنس، ہمدرد یونیورسٹی، نئی دہلی،
ڈاکٹر آر کے آنند ڈائرکٹر این.ٹی.کیو.سی.، ڈیپارٹمنٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، پروفیسر مشتاق احمد پیر ڈائرکٹر کمپیوٹر سینٹر، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر۔
دائیں جانب تشریف فرما ہیں ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ پرنسپل پبلیکیشن آفیسر قومی اردو کونسل اور جناب حامد حسن۔

ماہ نامہ

# اردو دُنیا نئی دہلی

جلد۔7، شمارہ۔6 جون 2005

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

معاون مدیر: فیروز عالم

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی واعلا تعلیم، حکومتِ ہند

کمپوزنگ: قومی اُردو کونسل

مطبع: جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی 6

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اُردو کونسل

قیمت -/10 روپیے، سالانہ -/100 روپے

چیک یا ڈرافٹ NCPUL کے نام روانہ کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی - 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746

شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

## اس شمارے میں


| | | |
|---|---|---|
| آپ کی بات | خطوط | 2 |
| ہماری بات | اداریہ | 5 |
| ● کبیر بانی کا فکری و تہذیبی پس منظر | ابوذر ہاشم | 6 |
| ● آرتھر طر — اپنے ڈراموں کے آئینے میں | مدن لال کپور | 11 |
| ● فرانسوا اردو زبان کا جرمن شاعر | بیگم دختر جہاں | 13 |
| ● قومی اردو کونسل کا فنکشنل عربی کورس | سید محمد عمیر ندوی | 15 |
| ● آئنسٹائن کے نظریے کے سو سال | محمد خلیل | 17 |
| ● خلائی اسٹیشن کیا ہے؟ | شبیر احمد | 19 |
| ● نیا زمانہ، نئی حکمتِ عملی | رگھوناتھ اننت ماشیلکر | 21 |
| ● عوارضِ نفسانیہ | حکیم اشہر قدیر | 23 |
| اتیہاس کے جھروکے سے: | | |
| ● شنکر آچاریہ | مدن گوپال | 25 |
| گوشۂ ادب: | | |
| ● مظہر امام سے گفتگو | مکتی ورما | 27 |
| ● ذکر ایک ہمدم دیرینہ کا | مخمور سعیدی | 30 |
| ● قاضی سلیم — ضمیر کی آواز کا شاعر | ابرار رحمانی | 34 |
| ● نصف صدی کا ساتھ نصف گھنٹے میں ختم | مصطفیٰ علی اکبر | 38 |
| گوشۂ فروغ کتب | | |
| ● بشری خامیاں (کہانی) (''عکس اور برعکس'' سے اقتباس) | سدھا مورتی | 41 |
| ● لیزر (''آزادی کے بعد سے سائنس، ٹیکنالوجی اور ترقی'' سے اقتباس) | سید جعفر محمود | 43 |
| طلبہ کے لیے | | |
| ● پریزنٹیشن کو بہتر بنانا | امیت جین | 47 |
| ● محمد سعد الحسن خاں سے ایک ملاقات | رئیس احمد | 50 |
| ● اردو ناول (کوئز) | محمد عاشق خاں | 52 |
| ● بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-23) | محمد انعام الحق | 55 |
| اُردو خبرنامہ | ادارہ | 56 |
| تبصرہ و تعارف | کتابوں پر تبصرے | 68 |
| ● مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے / مرزا محمد زماں آزردہ | مبصر: رئیس احمد | |
| ● مہر / گلزار | مبصر: جاوید رحمانی | |
| ● ہندوستان کا صنعتی ارتقا / ڈاکٹر ڈی. آر. گیڈگل | مبصر: ایس. اے. رحمٰن | |
| ● مغیث الدین فریدی اور قطعاتِ تاریخ / شیخ عقیل احمد | مبصر: احمد کفیل | |
| ● آہنگ آگہی / پیارے لال رتن | مبصر: بسمل عارفی | |
| بچوں کا گوشہ | | |
| ● بی. آر. امبیڈکر (''ہمارے رہنما'' سے اقتباس) | انیل ایکبوٹے | 73 |

# آپ کی بات

■ **عابد حسین، امریکا میں ہندوستان کے سابق سفیر**
**237، سیکٹر-15، اے نوئیڈا- 201301**

اردو کے فروغ کے لیے آپ کی کوششوں کو میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ یہ زبان جو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی دین ہے، مختلف فرقوں میں باہمی اتحاد پیدا کرنے اور اردو بولنے والوں کو ایک نئی سمت عطا کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔

■ **فیروز احمد فیض، سکریٹری، محمد المسلمین لائبریری، محسن پورہ، ٹیوب ویل، مئوناتھ بھنجن، ضلع مئو- 275101 (یوپی)**

''اردو دنیا'' مارچ کا شمارہ ابھی ملا۔ نہایت پابندی کے ساتھ شائع ہونے والا یہ معیاری رسالہ ہر ماہ نئی جلوہ آرائیوں کے ساتھ موصول ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس رسالے کی توصیف و تعریف کے لیے ہمیں الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ امید ہے کہ انعامی کوئز کی شروعات سے جہاں ''اردو دنیا'' کے قارئین کی حوصلہ افزائی ہوگی وہیں ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگا۔ عام طور پر رسائل کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کراتے اور ان کی تعداد اشاعت بڑھانے کے لیے اس طرح کے انعامی مقابلے شروع کیے جاتے ہیں لیکن ''اردو دنیا'' کی اتنی زیادہ مقبولیت کے باوجود اس طرح کے انعامی مقابلے کی شروعات آپ کی نیک نیتی اور اردو ادب کی خدمت کے لیے پُرخلوص جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ خدا کرے آپ ہمیشہ اسی طرح اردو ادب کی خدمت انجام دیتے رہیں۔

■ **عظیم الدین انصاری، A31/67A، ملواپورہ، وارانسی- 221001**

مارچ کے ''اردو دنیا'' میں مجھے ایک نئی چیز دیکھنے اور پڑھنے کو ملی جس سے رسالے سے میری دلچسپی میں اضافہ ہوگیا، وہ ہے کوئز انعامی مقابلہ۔ آپ نے یہ انعامی مقابلہ شروع کرکے رسالے کی دلکشی میں اضافہ کردیا ہے۔ ''اردو دنیا'' کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے آپ کی کوششوں کی تعریف نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔

■ **محمد وصی اللہ حسینی، 82، بی بلاک، دارالشفا، لکھنؤ- 226001**

''اردو دنیا'' مسلسل زیرِ مطالعہ رہتا ہے۔ اس کا ہر شمارہ خوب سے خوب تر ہوتا ہے۔ حسن ادارت کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ سائنس و ٹیکنالوجی پر مبنی مضامین نہ صرف جہانِ نو کی سیر کراتے ہیں بلکہ معلومات میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔ تراجم شائع کرنے کا سلسلہ بھی بہت ہی اچھا قدم ہے۔ جہاں دیگر زبانوں کے نام نہاد علم بردار دوسری زبانوں کے خلاف محاذ قائم کیے ہوئے ہیں، آپ تراجم شائع کرکے لسانی و فکری یک جہتی کا پیغام عام کررہے ہیں۔ اس سے ایک دوسرے کے افکار و نظریات سے واقف ہونے کا موقع ملتا ہے اور معاشرے کو صحیح سمت دینے میں مدد ملتی ہے۔ ہندوستان کثیر مذہبی، کثیر ثقافتی اور کثیر لسانی ملک ہے، جس میں افہام و تفہیم کی بڑی ضرورت ہے۔ آپ تراجم کے ذریعے اس ضرورت کو بڑی حد تک پورا کررہے ہیں اور ایک دوسرے کو قریب لارہے ہیں۔

■ **قاضی ارشاد حسین، ہمدرد بلڈنگ، آصف علی روڈ، نئی دہلی-2**

ذاکر حسین میموریل ایوارڈ سے آپ کو نوازے جانے کی خبر باعث مسرت ہے۔ آپ کی ماہرانہ قیادت میں کونسل کی طرف سے اردو کی بقا اور ہمہ جہت ترقی کے لیے جو اقدامات کیے جارہے ہیں اس کے حوصلہ افزا اور مفید نتائج مرتب ہورہے ہیں۔ اردو کی تعلیم اور اردو داں طبقے کو انفارمیشن ٹیکنالوجی سے جوڑنے کے مقصد سے ہندوستان گیر پیمانے پر کمپیوٹر مراکز کا جال پھیلانا اہم کارنامہ ہے۔ اس تعلیم اور تربیت سے اردو داں طبقے کے وقار میں بھی اضافہ ہوگا اور روزگار کے حصول میں بھی سہولت ہوگی۔ کونسل کے سارے کارناموں میں آپ کی اعلیٰ انتظامی صلاحیت جلوہ گر ہے۔ میری نظر میں ایسی کرشمہ ساز، باصلاحیت اور قدآور شخصیت کے لیے یہ ایوارڈ کم ہے۔

■ **رضوان خاں، 96، شیخ سرائے، سیتاپور**

''اردو دنیا'' کا مارچ کا شمارہ زیرِ مطالعہ ہے۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے قومی اردو کونسل کا نائب چیئرمین بننے پر اردو حلقوں میں بڑی خوشی محسوس کی جارہی ہے۔ محترم فاروقی صاحب کی شخصیت قابلِ احترام ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی اثرانگیز ہے کہ ہر خاص و عام کو اپنا گرویدہ بنالیتی ہے۔ فاروقی صاحب جہاں ایمانداری کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے ہیں وہیں دورانِ ملازمت ایک نیک نام اور باوقار افسر بھی رہے ہیں۔ اس خبر نے بھی اردو والوں کو مسرور کیا کہ آپ کو ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ واقعی آپ اس ایوارڈ کے مستحق ہیں۔ آپ نے اردو زبان اور ادب کے لیے جو کارہائے نمایاں

انجام دیے ہیں وہ لائقِ احترام و اعتراف ہیں۔ اس شمارے کے تمام مضامین اور مستقل کالم اہمیت کے حامل ہیں۔

■ **احمد عثمانی، 70، بنشی شعبان نگر، مالیگاؤں-423203**

مارچ کا ''اردو دنیا'' بہت ہی سجا سنورا ہے۔ ٹائٹل سادہ لیکن پُرکشش ہے۔ مضامین میں تنوع ہے۔ سبھی مضامین اچھے ہیں۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی کو قومی اردو کونسل کا وائس چیئرمین بنایا گیا ہے انھیں مبارکباد اور اچھا تعارف پیش کرنے کے لیے آپ کو بھی مبارکباد۔ ڈاکٹر تاثیر پر ہری چند اختر کا مضمون عمدہ ہے لیکن ادھورا محسوس ہوتا ہے۔

''رومن اردو کا ایک جامع نظام'' جناب سرور عالم نے بڑی عرق ریزی سے لکھا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اردو رسمِ خط کا بدل کوئی دوسرا رسمِ خط ہو ہی نہیں سکتا۔ صرف چند حوالے دیکھیے۔

بُت، but، بٹ: اس لفظ کو جناب سرور عالم نے اردو میں بُت لکھا ہے۔ جبکہ ت کا حرف انگریزی میں نہیں ہے اور T کو 'ت' کا متبادل نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح لفظ ''گزر'' ہے جسے انگریزی حروف میں guzar لکھا گیا ہے۔ اگر کوئی غیر اردو داں guzar لفظ اپنی زبان سے ادا کرے گا تو وہ انگریزی کے ہجے کے لحاظ سے 'گزار' ادا کرے گا۔ اسی طرح کئی الفاظ ہیں جن کے تلفظ سے غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے۔

■ **ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، ڈومن پورہ (کساری) مئو ناتھ بھنجن (یوپی)**

اردو کے عظیم دانشور اور مفکر جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا وائس چیئرمین مقرر ہونے پر میری طرف سے اردو والوں کو دلی مبارکباد۔ امید ہی نہیں بلکہ یقین کامل ہے کہ جناب ارجن سنگھ کی سربراہی، جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی وائس چیئرمین شپ اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کی قیادت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان پہلے سے زیادہ فعال ثابت ہوگی اور اپنے فروغ اردو زبان کے مجوزہ کاموں میں مزید پیش رفت کا مظاہرہ کرے گی۔

ماہنامہ ''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ بابت اپریل 2005 پیش نظر ہے۔ رسالہ حسب سابق صوری اور معنوی ہر لحاظ سے معیاری اور دیدہ زیب ہے۔ اداریہ سمیت جناب غلام نبی مومن کا مضمون ''نصاب تعلیم اور قومی یکجہتی''، عثمان شاہد کا ''اردو تعلیم۔ کیفیت اور تدابیر'' اور جناب محمد فاروق اعظمی کا ''بچوں کی تعلیم و تربیت'' تعلیم سے متعلق اچھے مضامین ہیں۔

دہلی اردو کتاب میلے کی فیروز عالم کی تحریر کردہ رپورٹ اور تصاویر سے دہلی اردو کتاب میلے کی تفصیلات سے آگاہی ہوئی۔ اردو کتاب میلہ اور کتابوں کی موبائل وین قومی اردو کونسل کے ایسے تاریخ ساز کارنامے ہیں جو فراموش نہیں کیے جاسکتے۔ مذکورہ دونوں پروگراموں کے تحت کونسل نے براہِ راست قارئین سے رابطہ قائم کرکے ان کے مسائل اور ضرورتوں کو سمجھنے اور ان کے مطابق کتب کی فراہمی پر جو توجہ دی ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔

■ **درشن کپور تلک، 24، تیغ بہادر روڈ، دہرہ دون-248001**

''اردو دنیا'' کے مارچ 2005 کے شمارے میں ''حسنِ نظر'' پر تبصرہ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ یقین مانیے میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میری نظمیں اور غزلیں اردو ادبی حلقے میں مقبولیت تو کیا کبھی قبولیت کی قطار میں بھی کھڑی ہونے کے قابل سمجھی جائیں گی۔ بے شک آپ نے بہت بڑا کردار نبھایا ہے۔ میں آپ کی محبت اور بے پناہ خلوص کو سلام کرتا ہوں اور اپنی نظم ''احساس'' کا وہ حصہ آپ کی نذر کرتا ہوں جو شاید انھی جذباتی لمحات کا نتیجہ ہے جب انسان ایسے دوراہے پر آجاتا ہے جہاں وہ بے حد ممنون تو ہوتا ہے مگر ''شکریہ'' کہنا اسے بہت بے آب سا لگتا ہے۔

تو مرا جسم نہیں دل بھی نہیں جان نہیں
کوئی پہچان نہیں پھر بھی تو انجان نہیں
اُف! ہر اک رشتے کا کوئی نام ہوا ایسا کیوں ہے
میرا احساس ہی بے نام ہو ایسا کیوں ہے

■ **اسرار احمد اعظمی، لکچرر، جی آئی سی، بارہ بنکی، یوپی**

''اردو دنیا'' وہ کام انجام دے رہا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ واقعی اردو زبان اور اردو والوں کو اس سے بہت فائدہ ہو رہا ہے۔ ادب، فلسفہ، تاریخ، سائنس، ٹیکنالوجی، کمپیوٹر غرض کہ مختلف شعبہ ہائے حیات کا احاطہ یہ رسالہ کر رہا ہے۔ اس میں جدید سے جدید موضوعات پر معیاری معلوماتی مضامین پیش کیے جا رہے ہیں۔ اردو کے طالب علم کی حیثیت سے میری ضرورت کی ساری چیزیں اس میں مل جاتی ہیں۔ ''اردو دنیا'' کے تمام مضامین معنی خیز، دلکش، موثر اور علم میں اضافہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ مقابلہ جاتی امتحانات کے متعلق معلومات اور کورز کی اشاعت اردو اور اس کے طالب علموں کے لیے بہت مفید ثابت ہو رہی ہے۔ ''اردو دنیا'' کا بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ میں اسے پابندی سے شروع سے آخر تک پڑھتا ہوں۔

■ **محمد امتیاز احمد، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی**

فروری 2005 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اس میں اردو صحافت کے حوالے سے دو مضامین شامل ہیں۔ پہلا جی. ڈی. چندن کا ''اردو صحافت اکیسویں صدی کے اوائل میں'' اور دوسرا نوشاد مومن کا ''مغربی بنگال میں اردو صحافت — آزادی کے بعد''۔ اول الذکر مضمون اپنے موضوع سے بھرپور انصاف کرتا ہے۔ ثانی الذکر کا تعلق بنگال کی اردو صحافت سے ہے، جو بڑی محنت سے لیکن غیر محتاط ہو کر لکھا گیا ہے۔ اس میں کئی جگہ ایسی باتیں ہیں جو کھٹکتی ہیں۔ مثلاً بنگال کی اردو صحافت کے ضمن میں مولانا محمد علی جوہر کے انگریزی اخبار ''کامریڈ'' (1911) کا حوالہ دیا گیا ہے جو موضوع سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے پیغام، پیام اور ہند کا ذکر کیا ہے لیکن اس کی وضاحت نہیں کی کہ آیا یہ ہفت روزہ

تھے یا روزانہ یا سہ روزہ؟ جہاں ''پیام'' (1927) کا ذکر کیا گیا ہے وہاں الہلال (دور ثانی) جو اسی سال یعنی (1927) میں جاری ہوا تھا، اس کا کوئی ذکر نہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ الہلال (دور ثانی) کے بغیر الہلال کا صحافتی سفر مکمل شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں نکلنے والے ہفت روزہ ''ہند'' کا سنہ اجرا 1934 درج ہے، جو درست نہیں۔ دراصل یہ اخبار 1929 میں جاری ہوا تھا۔ پھر سہ روزہ اور روزانہ کی صورت میں بھی چھپا۔ جو کبھی ہند، نو ہند، روزانہ ہند، ہند جدید وغیرہ کے ناموں کی تبدیلی کے ساتھ جاری رہا۔

■ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، سابق ممبر راجیہ سبھا

اردو دنیا کا اپریل 2005 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا اور اس کے معلوماتی مضامین سے مستفید ہوا۔ اس شمارے میں ''اے۔ کے ہنگل سے گفتگو'' بڑی توجہ سے پڑھا۔ علامہ مشرقی کی پارٹی کا نام خاکسار جماعت تھا نہ کہ بیلچہ پارٹی، اس پارٹی یا جماعت کے ہر کارکن کے لیے بیلچہ رکھنا لازمی تھا۔ البتہ یہ بات خلاف واقعہ ہے کہ اس پارٹی کا بنیادی اصول عدم تشدد تھا اور یہ بھی خلاف واقعہ ہے کہ سارا سرحدی علاقہ یعنی شمال مغربی سرحدی صوبہ اس پارٹی کے زیر اثر تھا۔ یہ صوبہ آخر تک مشہور قومی رہنما خان عبدالغفار خاں کے اثر میں رہا۔ 1946 کے تاریخی صوبہ جاتی اسمبلیوں کے الیکشن میں مسلم لیگ کو اس صوبے میں شکست کا سامنا کرنا پڑا اور خان عبدالغفار خاں کی وجہ سے کانگریس کو اس صوبے میں الیکشن میں کامیابی حاصل ہوئی۔

فروری کے شمارے میں کوئز میں ایک جواب غلط شائع ہوا ہے سید احمد خاں نے خواجہ الطاف حسین حالی کے ''مناظرہ رحم و انصاف'' کو اپنے لیے توشۂ آخرت قرار نہیں دیا تھا بلکہ انھوں نے یہ بات ''مسدس حالی'' کے بارے میں کہی تھی۔

بہتر ہوگا اگر آپ اردو کے جلیل المرتبت اور صاحب طرز ادیبوں مثلاً علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالکلام آزاد، رتن ناتھ سرشار، مولوی عبدالحق، خواجہ حسن نظامی، راشد الخیری، نواب جعفر علی خاں اثر اور خواجہ محمد شفیع کی تحریریں بھی شائع کریں۔

■ چاند میاں طیب، 105/129، جبلی کالج روڈ، چمن گنج، کانپور

''اردو دنیا'' کا نیا شمارہ اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے۔ آپ جیسے ادب نوازوں کی بدولت ہی صرف 10 روپے میں اتنا اچھا رسالہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ جہاں دیگر رسائل قارئین کے خطوط آخر میں شائع کرتے ہیں وہیں آپ شروع میں انھیں جگہ دیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ قارئین کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ اس رسالے کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں غیر مسلم قلم کار بھی کافی تعداد میں نظر آتے ہیں۔

■ افتخار الحسن، مدرسہ شمس العلوم، گھوسی، مئو، یوپی

میں ''اردو دنیا'' کا کافی دنوں سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس رسالے سے میری دلچسپی جنون کی حد تک ہے۔ مہینہ گزرنے کے بعد ہر اگلے دن ڈاک میں ''اردو دنیا'' کا انتظار رہتا ہے اور جب تک رسالہ ہاتھ میں نہیں آجاتا، چین نصیب نہیں ہوتا۔ خاص طور سے مجھے طلبہ کے لیے کالم اور کوئز کالم زیادہ پسند ہیں۔ اس کے علاوہ بچوں کا کالم بھی بہت اچھا ہے۔

■ پروفیسر نظام الدین، محلہ سازگاری پورہ، سری نگر۔ 190011 (کشمیر)

اردو زبان کے فروغ کے لیے آپ کئی برسوں سے کام کر رہے ہیں اور اس کے لیے آپ کو اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ میری طرف سے دلی مبارک باد۔

آپ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ کے رسائل کبھی کبھی دیکھنے کا موقع ملتا ہے جو واقعی بہت مفید ہیں۔ آپ نئے قلم کاروں کی بھی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اردو میں کمپیوٹر کی تعلیم کو آپ نے عوام تک پہنچانے کا قابل تحسین کام کیا ہے۔

■ جگدمبا دوبے، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

''اردو دنیا'' فروری کے سرورق پر سونامی کے قہر کی تصویر دیکھ کر بے حد متاثر ہوا۔ اس شمارے کے تمام مضامین معلوماتی ہیں۔ سید سلیمان اختر کا مضمون ''اردو اور ہندستانی فلمیں'' پسند آیا۔ آپ کی ہمہ جہت شخصیت نے نہ صرف اردو کونسل کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا ہے بلکہ اردو داں طبقے کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔ آپ ہر ماہ کسی نہ کسی معتبر شخصیت کا انٹرویو ''اردو دنیا'' میں شائع کرتے ہیں، یہ سلسلہ بہت اچھا ہے۔

■ شہزادہ محمد آصف خاں غوری (جنوبی درگاہ ممتاز محل بیگم) اشرف اسٹوڈیو، برہان پور، ایم پی

اردو تعلیم کو جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی سے جوڑنے میں اہم خدمات کے لیے آپ کو ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ اس پُر مسرت اور یادگار موقعے پر میری طرف سے دلی مبارکباد۔

■ ملتفی اختر حسین، اردو کالج، وگیان نگر، کوٹہ (راجستھان)

''اردو دنیا'' فروری 2005 کے تمام مضامین بڑے دلچسپ اور کارآمد ہیں بالخصوص ''موبائل فون کے مفید و مضر اثرات'' کا فوٹو اسٹیٹ کرا کر میں نے یہاں تقسیم کیا جسے لوگوں نے بہت سراہا۔ میں صمیم قلب سے اس ماہنامے کے عروج و ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔

■ ایس۔ ایم نہال آتش، فرینڈس کالونی، موہن پور، جھارکھنڈ

کئی مہینوں سے ''اردو دنیا'' کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ رسالے نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ یہ رسالہ زبان اردو کے فروغ کے لیے ہر سطح پر کوشاں نظر آتا ہے۔

اس میں ایسے دلچسپ معلوماتی مضامین شائع ہوتے ہیں جو اردو داں طبقے کے دل و دماغ کو تسکین فراہم کرتے ہیں۔ ترجموں پر مبنی معلوماتی مضامین کی شمولیت ایک اچھی کوشش ہے۔

□□□

# ہماری بات

ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے اور کسی بھی جمہوری ملک کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے تمام شہریوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں۔ مذہب، نسل، ذات، جنس یا مقام پیدائش کی بنا پر ان سے کسی طرح کا امتیاز نہ برتا جائے اور سب کو ترقی کے یکساں مواقع فراہم ہوں۔ ہندوستانی آئین کی تمہید میں لکھا گیا ہے کہ ''ہم بھارت کے عوام سنجیدگی سے عزم کرتے ہیں کہ بھارت کو ایک خود مختار، سماجوادی، غیر مذہبی، عوامی جمہوریہ بنائیں اور تمام شہریوں کے لیے

سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف

خیال، اظہار، عقیدہ، دین اور عبادت کی آزادی

حیثیت اور مواقع کی مساوات

کو یقینی بنائیں اور ان سب امور میں

باہمی اخوت کو فروغ دیں جس سے فرد کے احترام اور قوم کے اتحاد اور سالمیت کا تیقن مستحکم ہو۔''

یہی وہ رہنما خطوط ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر گذشتہ چھپن برسوں میں ہمارے ملک نے دنیا کے اہم جمہوری ممالک کی صف اوّل میں اپنی جگہ بنائی ہے اور ہر مذہب، جنس، طبقے اور علاقے سے تعلق رکھنے والے عوام نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی نمایاں کارکردگی سے ملک و قوم کا نام روشن کیا ہے۔ موجودہ صدر جمہوریہ ہند عالی جناب ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام بھی ہمارے ملک کے ان مایۂ ناز فرزندوں میں سے ہیں جن پر بجا طور پر پوری قوم فخر کر سکتی ہے۔ وہ مدراس کے ایک قصبے رامیشورم میں متوسط طبقے کے ایک ماہی گیر خاندان میں پیدا ہوئے اور اپنی محنت اور لگن سے تعلیم اور ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کرتے ہوئے ملک کے سب سے بڑے عہدے تک پہنچے ہیں۔

گذشتہ اٹھارہ اپریل کو صدرِ موصوف کی خود نوشت سوانح ''وِنگس آف فائر'' کے اردو ایڈیشن ''پرواز'' (مترجم: حبیب الرحمٰن چغانی، ناشر: قومی اردو کونسل) کی پہلی کاپی انھیں پیش کی گئی۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام کی داستانِ حیات ہی پیش نہیں کی گئی ہے بلکہ دفاعی میدانوں میں ہندوستان کی شاندار پیش رفت کی تاریخ بھی بیان کی گئی ہے۔ ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام نے اگنی، پرتھوی، آکاش، ترشول اور ناگ جیسے میزائلوں کی تیاری اور ہندوستان کو ایک نیوکلیائی طاقت بنانے میں جو اہم کردار ادا کیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ ایک عام ہندوستانی کے لیے یہ کارنامہ نہ صرف قابلِ فخر ہے بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔

ایک عام گھرانے میں پیدا ہونے کے بعد صدر جمہوریہ کے باوقار منصب تک پہنچ کر ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام نے کروڑوں ہندوستانیوں کو یہ سبق پڑھایا ہے کہ یقینِ محکم اور عملِ پیہم کے اصولوں پر چل کر ترقی کی اعلیٰ سے اعلیٰ منازل طے کی جا سکتی ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ احساسِ کمتری سے بالاتر ہو کر اپنے آدرشوں کی تکمیل کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا جائے۔ نامساعد حالات اور ناموافق صورتِ حال سے ہر انسان کو سابقہ پڑتا ہے اس سے گھبرا کر شکست تسلیم کر لینے کی بجائے نئے جوش اور جذبے سے آگے بڑھنے والے ہی عہد ساز شخصیات میں شمار ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر کلام کا بچپن غربت میں گزرا۔ اسکول کی فیس جمع کرنے کے لیے انھیں چھوٹے موٹے کام کرنے پڑتے تھے۔ ایم آئی ٹی. مدراس میں داخلے کے لیے ان کی بہن نے اپنی سونے کی چوڑیاں اور زنجیر رہن رکھ کر ایک ہزار روپے کا انتظام کیا اور تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے میں اپنے بھائی کی مدد کی۔ اسی وقت انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ رہن رکھی ہوئی چیزیں وہ اپنی کمائی سے واگذار کرائیں گے —اور اس کا ایک ہی راستہ تھا وظیفہ حاصل کرنا جس کے لیے انھوں نے پوری محنت کی۔ کالج میں پہنچنے کے بعد معاشی تنگی نے انھیں سبزی خور بنا دیا لیکن حالات کی سختیاں ان کے پائے ثبات کو متزلزل نہ کر سکیں اور وہ اپنے مقصد کی تکمیل میں مصروف اور منہمک رہے۔ آخر ان کی محنت بار آور ہوئی اور ایک دن ایسا بھی آیا جب وہ ملک کے سب سے بڑے دفاعی سائنس داں بن گئے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ ہند نے انھیں ملک کا سب سے بڑا شہری اعزاز ''بھارت رتن'' عطا کیا۔

ہماری نوجوان نسل کے لیے صدر جمہوریہ ایک مثالی کردار ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوان اپنے ملک کے جمہوری نظام پر پورا یقین رکھیں، اپنے مستقبل کا ایک لائحۂ عمل تیار کریں اور اس پر سنجیدگی سے عمل پیرا ہوں۔ اپنے آپ میں وہ ایسی صلاحیتیں پیدا کریں کہ وہ جس ادارے سے منسلک ہوں وہ ان کے حوالے سے پہچانا جائے۔ آج ہمارے ملک میں سب سے زیادہ تعداد نوجوانوں کی ہے اگر ملک کے سبھی نوجوان صحیح سمت میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں تو موجودہ صدی یقیناً ہماری ہوگی۔

ابوذر ہاشم

# کبیر بانی کا فکری پس منظر

کبیر بانی ہندوستان کے فلسفۂ ویدانت اور ایران کے نظریۂ تصوف کا نکتۂ اتصال ہے۔ ایک ایسا نکتہ جو علما کی فلسفیانہ موشگافی، مبلغوں کی تبلیغ اور ناظروں کے مناظرے سے عاری، لیکن گذشتہ چھ سو برسوں سے عوام کی زبان پر جاری ہے۔ بھکتی اور تصوف کے اس اتصال نے ایک سطح پر ہندو اور مسلمان کی تفریق کو ختم کر دیا۔ ایک طرف ہندوؤں نے کبیر کو اپنا سنت مانا تو دوسری جانب مسلمانوں نے انہیں اپنا شیخ یا شاہ تسلیم کرلیا۔ چنانچہ ''مخزن الاصفیا'' کے مصنف کبیر کو'' مرید و خلیفۂ شیخ تقی است' از اولیا اللہ ومشاہیرِ عہد خود است و جمالِ ولایت را در طریق ولایت مستور داشتہ و درموحدانِ وقت خود ممتاز بود' کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ دونوں فرقوں میں کبیر کی مقبولیت کا اندازہ اس روایت سے لگایا جاسکتا ہے کہ کبیر کی موت کی خبر پر آخری رسوم کی ادائیگی کے لیے دونوں فریقوں میں جنگ و جدال کی نوبت آگئی۔ حتیٰ کہ کبیر کو پھولوں کے ڈھیر کی شکل میں دو نصف ہو کر فریقین کی دلجوئی کرنی پڑی۔ کبیر کی تقسیم کا معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ لسانی بنیاد پر بھی وہ تقسیم ہوتے رہے ہیں۔ ہندی والوں نے کبیر داس کو اپنا بنالیا تو اردو والے بھی مصر ہیں کہ وہ اردو زبان کے شاعر ہیں۔ اور اس کے لیے ان کے پاس مضبوط دلائل بھی ہیں۔ وہ بھی کلامِ کبیر سے مثالیں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً کبیر کا ایک دوہا دیکھیے :

کبیر پڑھوا دور کر پستک دیو بہائی
باون اکھر سودھ کر رے الف میم چت لائی

اس دوہے میں رے، الف، میم کے حروف استعمال ہوئے ہیں، جو عربی یا اردو کے حروف ہیں اس لیے کبیر اردو کے شاعر ہیں۔ کبیر کے کلام میں ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں جن میں فارسی کے حروف اور الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ بلکہ ان کے کلام کا اصل مسودہ بھی فارسی رسم الخط میں تھا، جسے دیوناگری میں منتقل کرنے کی بنا پر بہت سی غلطیاں راہ پا گئی ہیں اور کلام تبدیل ہو گیا ہے۔ ایسے بہت سے دلائل ہیں جو کبیر کے اردو شاعر ہونے کے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں، لیکن حق تو یہ ہے کہ کبیر نے جس زمانے میں شاعری کی اس وقت ہندی یا اردو کا کینڈا مقرر نہیں ہوا تھا۔ زبانیں علاقائی تصرفات کے ساتھ ہندوستان کے طول وعرض میں بولی جاتی تھیں۔ کبیر نے سنسکرت کے بجائے ان علاقائی عوامی زبانوں میں اپنی بات کہی۔ اس میں ہندی اور اردو دونوں کی ابتدائی شکلیں شامل تھیں۔ اس لیے دونوں کے دعوے اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔

مطالعۂ کبیر دراصل متضاد اور متخالف رویے اور رجحانات کا حامل رہا ہے، جو بذاتِ خود اس کا بیّن ثبوت ہے کہ کبیر کی ذات اور فکر ہندوستانی پس منظر میں اس گنگا جمنی فکر و خیال کا سنگم تھی جو فلسفۂ ویدانت اور تصوف کی آمیزش سے پیدا ہوئی ہے۔ کبیر کا وجود خود بھی دو انتہاؤں کے سنگم سے عبارت رہا ہے۔ وہ ایک ہندو بیوہ کے بطن سے پیدا ہوئے لیکن پرورش و پرداخت ایک ایسے مسلم جولاہے (نورعلی) کے گھر میں ہوئی جو اسلام کا قیود و رسوم کی حد تک پابند تھا، اور اسلام کے متعلق عام (سطحی) معلومات رکھتا تھا۔ نورعلی کے اجداد ناتھ پنتھی تھے، لیکن اسلام قبول کرلیا تھا۔ ایسے نومسلموں میں ناتھ پنتھ کے اثرات باقی تھے، بلکہ آج بھی باقی ہیں۔ ناتھ پنتھیوں کے یہاں ناتھ (بھگوان) کی یاد ہی نجات کا واحد راستہ تھی۔ یعنی کبیر کو خدا یا بھگوان کی یاد (تصوف کی زبان میں عشقِ الٰہی) ورثے میں ملی تھی۔ کبیر کی رسمی تعلیم کسی مدرسے یا پاٹھ شالہ میں نہیں ہوئی۔ وہ خود کہتے ہیں:

مسی کاگد چھویو نہیں کلم گہیو نہیں ہاتھ
چاریو یگ کا مہاتم کھ بیں جتائی بات

(روشنائی اور کاغذ کبھی نہیں چھوا، قلم کبھی نہیں پکڑا، لیکن چاریگوں کے حالات میں نے زبان سے بیان کر دیے۔)

رسمی تعلیم کی عدم موجودگی میں کبیر نے جو کچھ بھی حاصل کیا، وہ خداداد صلاحیت، مشاہدے و تجربے، گیان دھیان، اس وقت کے سماج کے مثبت ومنفی رجحانات اور صوفی سنتوں کی صحبت کا نتیجہ تھا۔ کبیر بانی کی فکری اور نفسی کیف وکم کی شناخت کے لیے ان ہی نکات پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔

کبیر نے جس زمانے میں آنکھیں کھولیں وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی عروج کا زمانہ تھا۔ ایک طرف مسلم حکومت ہندوستان میں مستحکم ہو چکی تھی تو دوسری جانب مسلم صوفیا کی کاوشوں سے ہندوستان میں اسلام تیزی سے پھیل رہا تھا۔ ایسے میں ردعمل کے طور پر مسلمانوں کے تئیں بیزاری اور منافرت کی عام لہر بھی اٹھ رہی تھی اور مسلمانوں کو کھلے عام ملیچھ یا ترک کہا جاتا تھا۔ تبدیلی مذہب کا باعث مسلمانوں کا جاہ وحشم نہیں بلکہ چھوا چھوت، ذات پات، استحصال اور عدم مساوات سے نجات پاجانے کا یقین تھا۔ صوفیا کی

شخصیت بلاتفریق مذہب وملت سب کے لیے باعثِ کشش تھی۔ان کی تعلیم وتلقین بھی اسلام کے گہرے فقہی مسائل کی تفہیم یا بیان کے بجائے ذکر وفکر کی ہوا کرتی تھی جو ناتھ پنتھیوں کے قلبی میلان اور ویدانت کے بھکتی کے فلسفے سے قریب تر تھی۔اسلام کی پذیرائی اور مسلمانوں کی مخالفت کی اس فضا میں کبیر نے اپنے شعور کی آنکھیں کھولیں۔اس کے علاوہ ہندوستان کے مذاہب کی قدیم تاریخ جو سنتوں اور رشیوں کی زبانی سامنے آئی تھی وہ بھی یہ تھی کہ جب جب ویدک دھرم خودساختہ عقاید کی گمراہی میں کھوکر کمزور پڑا ہے اور اس کے نتیجے میں دوسرے مذاہب نے زور پکڑا ہے' تو بھکتی تحریک اس کے احیا کے لیے سامنے آئی ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ بھکتی کی اس خصوصیت نے ہی ہندو مذہب کے وجود کو باقی رکھا ہے' ورنہ یہ مذہب مرورِ ایام کے ہاتھوں اس قدر تبدیل ہوتا رہا ہے کہ اپنی اصل سے بہت دور جا پڑا۔اس مذہب کے بارے میں مشہور فلسفی ڈاکٹر رادھا کرشنن اپنی کتاب ''ہندوؤں کا نظریۂ زندگی'' میں لکھتے ہیں:

''بہت سے لوگ ہندو دھرم کو بلاعنوان کی فہرست کہتے ہیں۔کیا یہ مختلف عقاید کا عجائب خانہ ہے یا رسومات کا انبوہ یا محض جغرافیائی اظہار کا ایک نقشہ ہے؟ اس کے عقاید کی فہرست زمانہ بہ زمانہ تبدیل ہوتی رہی ہے۔ ویدک زمانے میں اس کا ایک مطلب تھا' برہمنی زمانے میں دوسرا اور بودھ زمانے میں تیسرا۔شیوا اسے ایک چیز سمجھتے ہیں' وشنو دوسری اور ساکت تیسری۔''

لیکن ہندو مذہب کے عقائد کا عجائب خانہ ہونے کے باوجود بھکتی اپنا جادو جگاتی رہی ہے۔ کبیر کے عہد طفلی میں بھی رامانند نے بھکتی کو فروغ دیا تھا اور کبیر ان کے شاگرد بھی بن گئے تھے۔ اس پس منظر میں کبیر بھی ہندو یا مسلم عقاید کی پیروی کرنے کی بجائے اپنی روح کی گہرائیوں میں اتر کر بھکتی کے اسیر ہوگئے اور برہموں کی اصطلاح ''برہما'' سے اپنے ''کرتا'' یا ''کھالک'' کو ممیز کرنے کے لیے ''رام'' یا ''ہری'' کی تراکیب پر تمام زور صرف کردیا۔گرچہ رام اور ہری کی اصطلاح غیر شعوری طور پر شروع سے ہی 'کرتا' یا 'خالق' کے لیے استعمال ہوتی آئی تھی' لیکن کبیر نے اس کا استعمال شعور کی سطح پر تواتر کے ساتھ کیا' تاکہ اسے برہموں کے ''برہما'' سے ممیز کیا جاسکے۔ اس بھکتی کے اسیر ہوکر وہ صوفیوں سے بھی ملتے اور ان کے اثرات قبول کرتے رہے۔ ان ہی اثرات کی بنا پر مسلم تذکرہ نویس انھیں شاہ کبیر کے نام سے بھی منسوب کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کبیر شیخ تقی کے مرید اور خلیفہ تھے۔اس مقام پر آکر کبیر کی فکر کا بنیادی ماخذ ایک بار پھر موضوعِ بحث بن جاتا ہے۔ کیا واقعی کبیر دیگر مسلم صوفیوں کی طرح اسلام کے مبلغ تھے؟ یا پھر ان کے یہاں ہندو اور مسلم آدرش آمیز ہوکر ایک نئے فلسفے کی شکل میں سامنے آئے؟ یا یہ کہ وہ بھی فلسفۂ ویدانت کے اسیر اور حکمت گرد شنکراچاریہ' رامانج' رامانند اور دیگر سنتوں کی طرح بھکتی کے پرچارک تھے۔

کبیر بانی پہلی نظر میں ہندو' مسلم ایکتا کے نظریے سے سرشار نظر آتی ہے اور ایک نئے آدرش کی بنیاد رکھتی ہے' جسے ہم دورِ حاضر کی اصطلاح میں Common religious code کہہ سکتے ہیں یا اکبر کی اصطلاح میں دینِ الٰہی۔ڈاکٹر رادھا کرشنن کی منقولہ رائے میں ہندو دھرم کو عقاید اور رسومات کا عجائب خانہ کہا گیا ہے۔کبیر نے بلاشبہ عقائد کے اس عجوبۂ روزگار اور رسومات کے انبوہ کو دھرم ماننے سے انکار کردیا' ساتھ ہی مسلمانوں کے بعض معمولات پر بھی معترض ہوئے اور مذہب کو بھکتی یا عشقِ الٰہی میں تلاش کیا۔کبیر کا کلام توحید' چھوا چھوت اور بت پرستی کی مذمت سے بھرا پڑا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کہے کبیر اداس فقیر اپنی راہ چل بھائی
ہندو ترک کا کرتا ایکی تاگتی لکھی نہ جائی

(فقیر کبیر اداس کہتا ہے کہ اپنی راہ چلو ہندو اور ترک [مسلمان] کا مالک ایک ہی ہے۔)

ہندو کہے رام موہے پیارا، مسلمان کہے رحیم
آپس میں دوئی لڑی مریں،نہ جانے کوئی مریم

(ہندو کہے کہ رام ہم کو پیارا ہے اور مسلم کہے کہ رحیم۔آپس میں دونوں اس پر لڑ مریں لیکن کوئی بھی اسے پہچانتا نہیں۔)

رام رحیم' کریما کیشو' ہری حضرت ہے سوئی
گہنا ایکے در ہے گہنا دینا اور نہ کوئی

(رام اور رحیم' کریم اور کیشو' ہری اور حضرت سب کچھ وہی ہے اور وہ ایک ہی زیور سب سے پہنتہ ہے)

ایسے تمام اشعار میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا خدا ایک ہے اور اس کو صحیح معنوں میں نہ پہچاننے کی شکایت کی گئی ہے۔کبیر ہندو اور مسلمان دونوں سے شاکی ہیں کہ وہ راہ سے بھٹک گئے ہیں اور رسومات میں قید ہیں۔وہ ان رسومات پر تنقید کرتے ہیں اور ''رام'' یا ''ہری'' کو نرا کار اور مالکِ کل مان کر من سے یاد کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں:

پاہن پوجے ہری ملے تو میں پوجوں پہار
تاتے یہ چاکی بھلی کہ پیس کھائے سنسار

(مورتی کو پوج کر اگر ہری مل سکتا ہے تو میں پہاڑ کو پوجوں' لیکن اس سے تو پتھر کی چکی بھلی ہے جس سے سنسار آٹا پیس کر کھاتا ہے۔)

اک جیوتی ہیں سب اپنا کون باہمن کون سودا

ابوذر ہاشم

# کبیر بانی کا فکری پس منظر

کبیر بانی ہندوستان کے فلسفۂ ویدانت اور ایران کے نظریۂ تصوف کا نکتۂ اتصال ہے۔ایک ایسا نکتہ جو علما کی فلسفیانہ موشگافی، مبلغوں کی تبلیغ اور ناظروں کے مناظرے سے عاری، لیکن گذشتہ چھ سو برسوں سے عوام کی زبان پر جاری ہے۔ بھکتی اور تصوف کے اس اتصال نے ایک سطح پر ہندو اور مسلمان کی تفریق کو ختم کر دیا۔ایک طرف ہندوؤں نے کبیر کو اپنا سنت مانا تو دوسری جانب مسلمانوں نے انہیں اپنا شیخ یا شاہ تسلیم کر لیا۔چنانچہ ''مخزن الاصفیا'' کے مصنف کبیر کو'' مرید و خلیفۂ شیخ تقی است' از اولیاءاللہ ومشاہیر عہد خود است و جمالِ ولایت را درطریق ولایت مستور داشتے و درموحداں وقتِ خود ممتاز بود' کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔دونوں فرقوں میں کبیر کی مقبولیت کا اندازہ اس روایت سے لگایا جا سکتا ہے کہ کبیر کی موت کی خبر پر آخری رسوم کی ادائیگی کے لیے دونوں فریقوں میں جنگ و جدال کی نوبت آگئی۔حتیٰ کہ کبیر کو پھولوں کے ڈھیر کی شکل میں دو نصف ہو کر فریقین کی دلجوئی کرنی پڑی۔کبیر کی تقسیم کا معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ لسانی بنیاد پر بھی وہ تقسیم ہوتے رہے ہیں۔ہندی والوں نے کبیرداس کو اپنا بنالیا تو اردو والے بھی مصر ہیں کہ وہ اردو زبان کے شاعر ہیں۔اور اس کے لیے ان کے پاس مضبوط دلائل بھی ہیں۔وہ بھی کلامِ کبیر سے مثالیں پیش کرتے ہیں۔مثلاً کبیر کا ایک دوہا دیکھیے :

کبیر پڑھوا دور کر پستک دیو بہائی
باون اکھر سودھ کر رے الف میم چت لائی

اس دوہے میں رے، الف، میم کے حروف استعمال ہوئے ہیں، جو عربی یا اردو کے حروف ہیں اس لیے کبیر اردو کے شاعر ہیں۔کبیر کے کلام میں ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں جن میں فارسی کے حروف اور الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔بلکہ ان کے کلام کا اصل مسودہ بھی فارسی رسم الخط میں تھا، جسے دیوناگری میں منتقل کرنے کی بنا پر بہت سی غلطیاں راہ پا گئی ہیں اور کلام تبدیل ہو گیا ہے۔ ایسے بہت سے دلائل ہیں جو کبیر کے اردو شاعر ہونے کے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں، لیکن حق تو یہ ہے کہ کبیر نے جس زمانے میں شاعری کی، اس وقت ہندی یا اردو کا کینڈا مقرر نہیں ہوا تھا۔زبانیں علاقائی تصرفات کے ساتھ ہندوستان کے طول و عرض میں بولی جاتی تھیں۔کبیر نے سنسکرت کے بجائے ان علاقائی عوامی زبانوں میں اپنی بات کہی۔اس میں ہندی اور اردو دونوں کی ابتدائی شکلیں شامل تھیں۔اس لیے دونوں کے دعوے اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔

مطالعۂ کبیر دراصل متضاد اور متخالف رویے اور رجحانات کا حامل رہا ہے، جو بذاتِ خود اس کا بیّن ثبوت ہے کہ کبیر کی ذات اور فکر ہندوستانی پس منظر میں اس گنگا جمنی فکر و خیال کا سنگم تھی جو فلسفۂ ویدانت اور تصوف کی آمیزش سے پیدا ہوئی ہے۔کبیر کا وجود خود بھی دو انتہاؤں کے سنگم سے عبارت رہا ہے۔وہ ایک ہندو بیوہ کے بطن سے پیدا ہوئے لیکن پرورش و پرداخت ایک ایسے مسلم جولاہے (نور علی) کے گھر میں ہوئی جو اسلام کا قیود و رسوم کی حد تک پابند تھا، اور اسلام کے متعلق عام (سطحی) معلومات رکھتا تھا۔نور علی کے اجداد ناتھ پنتھی تھے، لیکن اسلام قبول کر لیا تھا۔ایسے نو مسلموں میں ناتھ پنتھ کے اثرات باقی تھے، بلکہ آج بھی باقی ہیں۔ناتھ پنتھیوں کے یہاں ناتھ (بھگوان) کی یاد ہی نجات کا واحد راستہ تھی۔یعنی کبیر کو خدا یا بھگوان کی یاد (تصوف کی زبان میں عشقِ الٰہی) ورثے میں ملی تھی۔کبیر کی رسمی تعلیم کسی مدرسے یا پاٹھ شالہ میں نہیں ہوئی۔وہ خود کہتے ہیں:

مسی کاگد چھویو نہیں کلم گہیو نہیں ہاتھ
چاریو یگ کا مہاتم کہہ بیں جنائی بات

(روشنائی اور کاغذ کبھی نہیں چھوا، قلم کبھی نہیں پکڑا، لیکن
چاروں جگوں کے حالات میں نے زبان سے بیان کر دیے۔)

رسمی تعلیم کی عدم موجودگی میں کبیر نے جو کچھ بھی حاصل کیا، وہ خداداد صلاحیت، مشاہدے و تجربے، گیان دھیان، اس وقت کے سماج کے مثبت و منفی رجحانات اور صوفی سنتوں کی صحبت کا نتیجہ تھا۔کبیر بانی کی فکری اور نفسی کیف و کم کی شناخت کے لیے ان ہی نکات پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔

کبیر نے جس زمانے میں آنکھیں کھولیں وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی عروج کا زمانہ تھا۔ ایک طرف مسلم حکومت ہندوستان میں مستحکم ہو چکی تھی تو دوسری جانب مسلم صوفیا کی کاوشوں سے ہندوستان میں اسلام تیزی سے پھیل رہا تھا۔ ایسے میں ردعمل کے طور پر مسلمانوں کے تئیں بیزاری اور منافرت کی عام لہر بھی اٹھ رہی تھی اور مسلمانوں کو کھلے عام ملیچھ یا ترک کہا جاتا تھا۔تبدیلی مذہب کا باعث مسلمانوں کا جاہ و حشم نہیں بلکہ چھوا چھوت، ذات پات، استحصال اور عدم مساوات سے نجات پا جانے کا یقین تھا۔صوفیا کی

شخصیت بلاتفریق مذہب وملت سب کے لیے باعث کشش تھی۔ ان کی تعلیم وتلقین بھی اسلام کے گہرے فقہی مسائل کی تفہیم یا بیان کے بجائے ذکر وفکر کی ہوا کرتی تھی جو ناتھ پنتھیوں کے قلبی میلان اور ویدانت کے بھکتی کے فلسفے سے قریب تر تھی۔ اسلام کی پذیرائی اور مسلمانوں کی مخالفت کی اس فضا میں کبیر نے اپنے شعور کی آنکھیں کھولیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مذاہب کی قدیم تاریخ جو سنتوں اور رشیوں کی زبانی سامنے آئی تھی وہ بھی یہ تھی کہ جب جب ویدک دھرم خودساختہ عقاید کی گمراہی میں کھو کر کمزور پڑا ہے اور اس کے نتیجے میں دوسرے مذاہب نے زور پکڑا ہے' تو بھکتی تحریک اس کے احیا کے لیے سامنے آئی ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ بھکتی کی اس خصوصیت نے ہی ہندو مذہب کے وجود کو باقی رکھا ہے' ورنہ یہ مذہب مرور ایام کے ہاتھوں اس قدر تبدیل ہوتا رہا ہے کہ اپنی اصل سے بہت دور جا پڑا۔ اس مذہب کے بارے میں مشہور فلسفی ڈاکٹر رادھا کرشنن اپنی کتاب ''ہندوؤں کا نظریۂ زندگی'' میں لکھتے ہیں:

''بہت سے لوگ ہندو دھرم کو بلا عنوان کی فہرست کہتے ہیں۔ کیا یہ مختلف عقاید کا عجائب خانہ ہے یا رسومات کا انبوہ یا محض جغرافیائی اظہار کا ایک نقشہ ہے؟ اس کے عقاید کی فہرست زمانہ بہ زمانہ تبدیل ہوتی رہی ہے۔ ویدک زمانے میں اس کا ایک مطلب تھا' برہمنی زمانے میں دوسرا اور بودھ زمانے میں تیسرا۔ شیوا سے ایک چیز سمجھتے ہیں' وشنو دوسری اور ساکٹ تیسری۔''

لیکن ہندو مذہب کے عقائد کا عجائب خانہ ہونے کے باوجود بھکتی اپنا جادو جگاتی رہی ہے۔ کبیر کے عہد طفلی میں بھی راما نند نے بھکتی کو فروغ دیا تھا اور کبیر ان کے شاگرد بھی بن گئے تھے۔ اس پس منظر میں کبیر بھی ہندو یا مسلم عقاید کی پیروی کرنے کی بجائے اپنی روح کی گہرائیوں میں اتر کر بھکتی کے اسیر ہو گئے اور برہمنوں کی اصطلاح ''برہما'' سے اپنے ''کرتا'' یا ''کھالک'' کو ممیز کرنے کے لیے ''رام'' یا ''ہری'' کی تراکیب پر تمام زور صرف کر دیا۔ گرچہ رام اور ہری کی اصطلاح غیر شعوری طور پر شروع سے ہی 'کرتا' یا 'خالق' کے لیے استعمال ہوتی آئی تھی' لیکن کبیر نے اس کا استعمال شعور کی سطح پر تواتر کے ساتھ کیا' تاکہ اسے برہمنوں کے ''برہما'' سے ممیز کیا جا سکے۔ اس بھکتی کے اسیر ہو کر وہ صوفیوں سے بھی ملتے اور ان کے اثرات قبول کرتے رہے۔ ان ہی اثرات کی بنا پر مسلم تذکرہ نویس انھیں شاہ کبیر کے نام سے بھی منسوب کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کبیر شیخ تقی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اس مقام پر آ کر کبیر کی فکر کا بنیادی ماخذ ایک بار پھر موضوع بحث بن جاتا ہے۔ کیا واقعی کبیر دیگر مسلم صوفیوں کی طرح اسلام کے مبلغ تھے؟ یا پھر ان کے یہاں ہندو اور مسلم آدرش آمیز ہو کر ایک نئے فلسفے کی شکل میں سامنے آئے؟ یا یہ کہ وہ بھی فلسفۂ ویدانت کے اسیر اور جگت گرو شنکراچاریہ' رامانج' رامانند اور دیگر سنتوں کی طرح بھکتی کے پرچارک تھے۔

کبیر بانی پہلی نظر میں ہندو' مسلم ایکتا کے نظریے سے سرشار نظر آتی ہے اور ایک نئے آدرش کی بنیاد رکھتی ہے' جسے ہم دور حاضر کی اصطلاح میں Common religious code کہہ سکتے ہیں یا اکبر کی اصطلاح میں دین الٰہی۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کی منقولہ رائے میں ہندو دھرم کو عقاید اور رسومات کا عجائب خانہ کہا گیا ہے۔ کبیر نے بلاشبہ عقائد کے اس عجوبۂ روزگار اور رسومات کے انبوہ کو دھرم ماننے سے انکار کر دیا' ساتھ ہی مسلمانوں کے بعض معمولات پر بھی معترض ہوئے اور مذہب کو بھکتی یا عشق الٰہی میں تلاش کیا۔ کبیر کا کلام توحید' چھوا چھوت اور بت پرستی کی مذمت سے بھرا پڑا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کہے کبیر اداس فقیرا اپنی راہ چل بھائی
ہندو ترک کا کرتا ایکی تا گتی لکھی نہ جائی

(فقیر کبیر داس کہتا ہے کہ اپنی راہ چلو' ہندو اور ترک [مسلمان] کا مالک ایک ہی ہے۔)

ہندو کہے رام موہے پیارا، مسلمان کہے رحیم
آپس میں دوئی لڑی مریں، نہ جانے کوئی مریم

(ہندو کہے کہ رام ہم کو پیارا ہے اور مسلم کہے کہ رحیم۔ آپس میں دونوں اس پر لڑ مریں لیکن کوئی بھی اسے پہچانتا نہیں۔)

رام رحیم' کریما کیشو' ہری حضرت ہے سوئی
گہنا ایکے در ہے گہنا دیتا اور نہ کوئی

(رام اور رحیم' کریم اور کیشو' ہری اور حضرت سب کچھ وہی ہے اور وہ ایک ہی زیور سب سے پختہ ہے۔)

ایسے تمام اشعار میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا خدا ایک ہے اور اس کو صحیح معنوں میں نہ پہچاننے کی شکایت کی گئی ہے۔ کبیر ہندو اور مسلمان دونوں سے شاکی ہیں کہ وہ راہ سے بھٹک گئے ہیں اور رسومات میں قید ہیں۔ وہ ان رسومات پر تنقید کرتے ہیں اور ''رام'' یا ''ہری'' کو نرا کار اور مالک کل مان کر من سے یاد کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں:

پاہن پوجے ہری ملے تو میں پوجوں پہار
تاتے یہ چاکی بھلی کہ پیس کھائے سنسار

(مورتی کو پوج کر اگر ہری مل سکتا ہے تو میں پہاڑ کو پوجوں' لیکن اس سے تو پتھر کی چکی بھلی ہے جس سے سنسار آٹا پیس کر کھاتا ہے۔)

اک جیوتی ہیں سب اتپنا کون باہمن کون سودا

(سب ایک جیوتی سے پیدا ہوئے ہیں کوئی برہمن اور کوئی شودر نہیں)

سندھیا پرات اسنان کراہیں
جیوں بھئے داد اُپانی ماہیں

(صبح سویرے پتھر کی مورتیوں کو پانی سے دھوتے ہیں جیسے کہ پانی سے دھلنے کے بعد یہ زندہ ہو جائیں گی۔)

کہے کبیر موہے اچرج آوے
کوا کھائے پتر کیوں پاوے

(کبیر کہتا ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کوے کا کھایا ہوا مردے کو کیسے ملے گا)

اسی طرح وہ مسلمانوں کو بھی ان کے رسومات اور عقاید پر پھنکارتے ہیں۔ کبھی اذان کی رسم پر تو کبھی زکوٰۃ اور حج پر:

کانکر پاتھر جور کر مسجد لیا بنائے
تا چڑھ ملا بانگ دے بہرہ ہوا خدائے

(کنکر پتھر جوڑ کر مسجد بنا لیا۔ مُلّا اس پر چڑھ کر بانگ دے گا، کیا خدا بہرہ ہو گیا ہے۔) قبل عرض ہوا کہ کبیر اصطلاحاً تعلیم یافتہ نہ تھے۔ ان کی معلومات مطالعہ پر نہیں مشاہدے کی رہینِ منت تھیں۔ اس لیے وہ اذان کی آواز کو خدا کو سنانے پر محمول کرتے ہیں۔ محمود شیرانی اور بعض دوسرے مسلم اہل الرائے کا خیال ہے کہ یہ کلام الحاقی ہے' ورنہ کبیر اتنے نا واقف نہیں ہو سکتے کہ اذان کی غرض وغایت کو نہ سمجھیں۔ اگر اس تاویل کو صحیح بھی مان لیں تو بھی اسلام کی حقیقت سے کبیر کی واقفیت پر سوالیہ نشان لگا رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کلامِ کبیر میں دیگر مقامات پر بھی اذان کو خدا کو سنانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

نہ جانے تیرا صاحب کیسا ہے
مسجد بھیتر ملا پکارے کیا تیرا صاحب بہرا ہے
چیونٹی کے پگ نیورا باجے سو بھی صاحب سنتا ہے
پنڈت ہوئے کے آسن بارے تو بھی مالا جپتا ہے
انتر تیرے کپٹ کترنی سو بھی صاحب سنتا ہے

(مسجد کے اندر ملا آواز لگاتا ہے کیا تیرا خدا بہرا ہے' وہ چیونٹی کے پاؤں کی آواز بھی سن لیتا ہے' پنڈت ہو کر آسن مار کر مالا جپتا ہے لیکن تیرے اندر جو کینے کی قینچی ہے وہ خدا دیکھتا ہے۔)

اس دوہے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کبیر اذان کی اصلیت سے واقف نہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دوہا بھی الحاقی ہے۔ کسی شاگرد نے عقیدت میں ان کے طرز پر کہنے کی کوشش کی ہے جو بعد میں ان کے نام سے منسوب ہو گیا۔ لیکن اسلام سے کماحقہٗ واقفیت کی کمی پھر بھی بعض دیگر دوہوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً وہ قربانی پر معترض ہیں اور کہتے ہیں:

گلا کاٹ کر بسمل کریں تے کافر بے بوجھ
اور ان کو کافر کہیں اپنا کفر نہ سوجھ

(گلا کاٹ کر بسمل کرتے ہیں وہ بے بوجھے کافر ہیں۔ وہ دوسروں کو کافر کہتے ہیں مگر اپنا کفر بھائی نہیں دیتا۔)

بودھ اور جین مذاہب کے اثرات کے نتیجے میں ہندو دھرم میں زبردست تبدیلیاں آئیں۔ ان تبدیلیوں میں ایک تبدیلی یہ بھی ہے کہ جانوروں کی قربانی نہ دی جائے۔ وہ بھی جان رکھتے ہیں اور قربانی بھی دراصل قتل کے مترادف ہے۔ تشدد سے رام یا ہری خوش نہیں ہوتے۔ ویشنو کے ماننے والے بالخصوص قربانی کو پُن کی بجائے پاپ تصور کرتے ہیں۔ اس لیے کبیر معترض ہیں کہ مسلمان گلا کاٹتے ہیں اور خدا کا نام بھی لیتے ہیں۔ دوسروں کو کافر بھی کہتے ہیں' جب کہ ناسمجھی میں وہ خود کفر کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس دوہے میں کفر یا کافر دراصل اس عام خیال کی گونج ہے جو ہندوستان میں کم پڑھے لکھے لوگوں کی زبان پر رہا ہے۔ یعنی یہ کہ مسلمان اپنے علاوہ سب کو کافر سمجھتے ہیں' خواہ وہ ہندو ہو' سکھ ہو یا بدھ دھرم کا ماننے والا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی ذاتِ واحد یا کبیر کے لفظوں میں "ہری" یا "رام" کا انکار کرنے والا ہی کافر ہو سکتا ہے اور اس کی خدائی میں دوسروں کو شریک کرنے والا مشرک۔ اس دوہے سے بھی کبیر کے یہاں اسلامی معلومات کے فقدان کا پتہ چلتا ہے' اور تصویر یہ سامنے آتی ہے کہ وہ اسلام کے متعلق عام تصورات کے اسیر ہیں اور اسلام کو بھی رسومات کا پروردہ یا زائیدہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ ہندو اور مسلمان دونوں کو رسومات سے بلند ہو کر بھکتی کے رس میں ڈبو دینا چاہتے ہیں۔ بقول کبیر:

کہے کبیر اک رام جپو رے ہندو ترک نہ کوئی

(کبیر کہتا ہے کہ ایک رام کو جپو' کوئی ہندو ہے نہ ترک [مسلمان])

یا پھر

پیٹ میں کا ہو نہ وید پڑھایا
سنت کراکے ترک نہیں آیا

(پیٹ میں کسی کو وید نہیں پڑھایا گیا' ترک [مسلمان] پیٹ سے ختنہ کرا کے پیدا نہیں ہوا۔)

اس دوہے میں کبیر وید پڑھنے کو ہندو ہونے کی لازمی پہچان قرار دیتے ہیں تو سنت (ختنہ) کو ترک (مسلمان) کی شناخت بتاتے ہیں۔ یعنی مسلمانوں کے متعلق اس عام خیال کو پیش کرتے ہیں کہ ترک کی شناخت اس کا ختنہ کیا ہوا ہونا ہے۔ جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مسلمان تو وحدت پر ایمان کامل رکھنے سے ہوتا ہے خواہ اس کا ختنہ نہ ہو سکا ہو۔ یہاں بھی اسلام کی بنیادی معلومات سے کبیر کی عدم واقفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ

مسلمان کو ترک کے حوالے سے جانتے اور ترک کو مسلمان مانتے ہیں۔ یہ بھی اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ کبیر اسلام کی بجائے اپنی نظروں کے سامنے ترک کو دیکھتے ہیں' اور یہ مشاہدہ ہی ان کی فکر کا ماخذ ہے۔ اس طرح کبیر کی تحریک کا ماحصل یہ سامنے آتا ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک ہوکر ہری کو پوجیں اور اس کی اصلیت کو جانیں۔ کبیر کے افکار کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی اس پداولی کو سامنے رکھا جائے:

اپنے بچارا سواری کیجئے
سہج کے پانڈے پاؤ جب دیجئے
جن کبیرا ایسا اسدارا
بید کتیب دوہوں تھے نیارا

(مجھ بچارے کو اپنی زین بنانے دو اور عشقِ الٰہی کے رکاب میں پاؤں رکھنے دو۔ کبیر کہتا ہے کہ اچھے سوار وہی ہیں جو ویدوں اور قرآن مجید سے دور رہتے ہیں۔)

اپنے اس اصول کی بنا پر کبیر' قرآن' ختنہ' حج' ملا' قاضی' پنڈت' مورتی' مندر' شرادھ' اور چھوا چھوت سب کی نفی کرتے ہیں۔ وہ ہری' رام یا اللہ کے عشق میں خود کو ڈبو دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے عقاید معاشرے کی اچھائیوں اور برائیوں اور روزمرہ کے معمولات سے اخذ کیے اور ان ہی کے حوالے سے اپنی بات لوگوں کو اس طرح سمجھائی کہ ان پڑھ لوگوں کی بڑی تعداد نے اسے قبول کرلیا۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کبیر کے یہ معتقدات وید یا قرآن سے کتنے الگ' یا ویدانت سے کتنے قریب ہیں۔ عشقِ الٰہی تصوف کا خاص موضوع رہا ہے۔ دوسری جانب ویدانت نے بھکتی کے جذبے کو بیدار کیا ہے۔ کبیر یوں بھی سنتوں کے علاوہ صوفیوں سے بھی ملتے رہے ہیں۔ ان سنتوں اور صوفیوں نے کبیر کے افکار پر کیا اثر ڈالا؟ کبیر کی بھکتی یا عشقِ الٰہی کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس بھکتی اور عشق کا ماحصل کیا ہے؟ اس پر فلسفۂ ویدانت اور نظریۂ تصوف کے کیا اثرات ہیں؟ کبیر کے کلام کے مطالعے سے یہ نکات صاف ہوجاتے ہیں۔ چند مثالیں یہاں دیکھیے کبیر کہتے ہیں:

آیا سب پر ایک سمان
تب ہم پایا پد نروان
جب لگ بھاؤ بھکتی نہیں کر ہو
تب لگ بھو ساگر کیوں تر ہو
بن ہری بھکتی نہ مکتی ہوئی
کہے کبیر ہری بھکتی بن ناہیں کچھ مول

کبیر کی بھکتی یا عشق بس اس لیے ہے کہ مکتی حاصل ہوجائے۔ وہ خدا کے عشق میں اس لیے مبتلا نہیں ہوتے کہ اس سے جنت ملے گی بلکہ وہ کہتے ہیں:

جب لگ ہے بے کنٹھ کی آسا
تب لگ ہری چرن نواسا

(جب تک جنت کی امید ہے تب تک ہری کے قدموں کے نیچے نہیں رہ سکتے۔)

کبیر مکتی چاہتے ہیں۔ یہ مکتی آواگون سے مکتی ہے۔ خدا کی خوشنودی اس لیے کہ پھر جنم نہ لینا پڑے۔ برہموں نے آواگون سے نجات پانے کے لیے کرم کا نظریہ دیا تھا۔ بودھ مت نے گیان اور عشق کو نروان کا ذریعہ بتایا لیکن ویدانت نے عشقِ الٰہی میں ڈوب جانے کو مکتی کا ذریعہ بتایا۔ خدا کو عشق کے ذریعے اس طرح قریب کرلیا جائے کہ اس کا داس یا بھکت ہوکر بھی اس سے مہر و نوازش کی توقع رکھی جائے۔ ایسا تعلق کہ مالک اپنے 'داس' کی ناز برداری کا متمنی رہے۔ ویدانت نے خدا اور بندے کے عشق کے اس طور کو زن و شوہر کے عشق کی تمثیل میں پیش کیا ہے۔ کبیر بھی اپنے عشق کو زوج کے عشق سے تعبیر کرتے ہیں۔ جہاں خدا اپنے بھکت کے معاملات میں شوہر کی طرح دخیل بھی ہوتا ہے اور زن کا ناز بردار بھی۔ اس طرح ویدانت یا بھکتی وحدت کے تصور کے باوجود ثنویت کی علمبردار ہوجاتی ہے۔ وہ ثنویت جو ایران کے زرتشتیوں کا خاص وصف تھا۔ ایران کے زرتشت مزاجاً ہندستان کے بت پرستوں کے قریب تھے۔ اوستا بھی وحدت کا قائل ہے لیکن ثنویت سے بھی اسے بیر نہیں۔ اوستا کے مقدس نغمے وید کے مذہبی نغموں سے مطابقت بھی رکھتے ہیں۔ ایسے میں ویدانت کا فلسفہ ایران گیا تو ان کی بھی سیرابی کا سامان فراہم کرگیا۔ اور ویدانت کا فلسفۂ روحانیت ایک قوت بن گیا۔ اسلام ایک فعال اور مکمل نظامِ حیات بن کر ایران میں پھیلا تو زرتشت اور اوستا کے پرستار' جو ہند کے برہما کے بھکتوں کے مماثل تھے' نے عملی سطح پر اس قوت کو روکنے میں ناکام ہوکر اس روحانیت کا شوشہ اہلِ اسلام میں بھی چھوڑا۔ زرتشتوں نے فلسفۂ ویدانت سے رنگ و روغن حاصل کیا تھا۔ اسلام کے ایرانی کینوس پر بھی عشقِ الٰہی کا رنگ بھرا جانے لگا۔ بایزید بسطامی نے پہلی بار ابوعلی سندھی سے تصوف سیکھا اور اپنی ذات میں خدا کو سمولیا۔ اسلام نے ہمہ از اوست کی تعلیم دی تھی۔ معبود اور عبد اور خالق اور مخلوق کے رشتے پر زور دیا تھا۔ لیکن تصوف ویدانت کے فلسفے 'تت توام آسی'' یعنی'' وہ تم میں ہے'' کا اسیر ہوکر'' ہمہ اوست'' کا نعرہ لگا بیٹھا اور وحدۃ الوجود اور وحدت الشہود وغیرہ کے فلسفے میں الجھ گیا۔ اس طرح ایرانی تصوف نے بھی پچھلے دروازے سے حلول کے نظریے کو قبول کرلیا۔ ویدانت کے اسی نظریے نے بت پرستی اور قبر پرستی کی راہ ہموار کردی۔ تصوف انہی بھول بھلیوں میں کھو گیا اور جب یہ منصور تک آیا تو اناالحق کا نعرہ کھلے عام گونجنے لگا۔ جب ایرانی صوفیا اور حکام ہندوستان آئے تو اس

نظریے کو مسلمانی نظریے کے طور پر لائے۔ حالانکہ حلول کا نظریہ خالص ویدانت کا فلسفہ تھا۔ اس لیے ایک انگریز مصنف بجا طور پر کہتا ہے:

"Mysticism is the lyrical version of vedanta"

(تصوف [دراصل] ویدانت کا شاعرانہ بیان ھے۔)

کبیر کے یہاں یہی شاعرانہ بیان ایرانی تصوف سے آملا کر تصوف یا ویدانت سے متعلق ان کی معلومات مطالعے یا تحقیق کا حاصل نہ تھیں بلکہ بقول کبیر:

تیرا میرا منوا کیسے ایک ہوئے رے
میں کہتا ہوں آنکھوں دیکھی
تو کاگد کی لیکھی
میں کہتا ہوں ساجن باری
تو رکھیو اوجھائی رے

اسی آنکھوں دیکھی میں ترکوں کا تصوف بھی تھا اور ہندوستانی معاشرے کے رگ و پے میں جاری ویدانت کے معتقدات بھی۔ چنانچہ کبیر نے گرچہ کہ وحدت کے گیت گائے، لیکن عشق یا بھگتی کی اس منزل سے گذرے بھی جس کی تمثیل زن و شوہر کے رشتے سے دی گئی ہے۔ کبیر نے اپنی بھگتی میں خدا کو شوہر کا درجہ بھی دیا ہے اور زوج کو بیوی کا۔ اس طرح وہ وحدت کا نعرہ لگانے کے باوجود ثنویت کا شکار ہوگئے۔ تناسخ سے مکتی پانے کے لیے ہی انھوں نے بھگتی کو اپنایا۔ کبیر خود کہتے ہیں:

دیکھو کرم کبیر کا
کچھ پرب جنم کا لیکھا
جنم انیک گیا اور آیا
جیوں جل چھاڑی باہر بھیو مینا
پرب جنم ہوں تپ کا ہینا

(دیکھو کبیر کا جنم پچھلے جنم کا لیکھا ہے۔ کئی ایک جنم آئے اور گئے۔ مچھلی کی طرح پانی چھوڑ کر نکل آیا [شاید] پچھلے جنم میں تپسیا میں کچھ کمی تھی۔)

آواگون کا یہ نظریہ ویدانت کی عطا ہے۔ جب تک مکتی نہ ملے آواگون کو جاری رہتا ہے اور مکتی کی صورت کبیر کی نظر میں رام بھگتی ہے۔ یہ بھگتی جب ایرانی فلسفے ہمہ اوست سے لاگ کھاتی ہے تو کبیر کے الفاظ میں پکار اٹھتی ہے:

کھالک ہے کھلک، کھلک میں کھالک
سب گھٹ رہو سمائے

(خالق خلق ہے اور خلق میں خالق، سبھوں میں وہ سمایا ہوا ہے)

اور جب یہ "تت توام آسی" کی تفسیر بنتی ہے تو کہتی ہے:

رام کبیرا ایک بھئے ہیں کون سکے پہچان

یا پھر:

تیرا سائیں تجھ میں بسے جیوں پہُوپن میں باس
کستوری کا مرگ جیوں پھر پھر ڈھونڈھے گھاس

(تیرا مالک تجھ میں اسی طرح بستا ہے جیسے پھولوں میں خوشبو اور تو اس کو اِدھر اُدھر تلاش کرتا ہے۔ جس طرح ہرن اس بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ نافہ اس کے جسم میں ہے اور گھاس میں ڈھونڈتا ہے۔)

اس طرح کبیر بانی جب مسلمانی سے مَس کرتی ہے تو بھی ویدانت کے فلسفے آواگون، مکتی، نروان وغیرہ کے حصار میں ہوتی ہے اور جب مورتی پوجا، ذات پات، چھوا چھوت، اونچ نیچ اور شرادھ وغیرہ کی ملامت کرتی ہے تو بھی عقاید کے عجائب خانے اور رسومات کے انبوہ سے ہندو دھرم کو مکتی دلانے کا فرض انجام دیتی ہے اور اپنی قوت نمو بھی وہیں سے حاصل کرتی ہے۔

□□□

Flat No. 103, C.G.O. Quarters,
Belvedere, Alipur, Kolkata-27

**جراثیم**

**مصنف: بی وی بیرا شٹین/مترجم: شریف احمد خاں**

جراثیم کرۂ ارض پر پائے جانے والے مختلف النوع جانداروں میں بے حد اہم ہیں۔ یہ مفید بھی ہیں اور مضر بھی۔ زندگی اور موت، صحت اور مرض ہر حالت میں جراثیم ہماری زندگی کا اہم جزو ہیں۔ زیر نظر کتاب میں جراثیم سے متعلق تفصیلی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

صفحات: 129، قیمت -/36 روپے

**چٹانیں بولتی ہیں**

**مصنف: وشنو مترا/مترجم: انوار رضوی**

چٹانیں ہماری کائنات کا اہم حصہ ہیں۔ اس کتاب میں زمین کی ابتدا اور ارتقا کے مختلف پہلوؤں سے متعلق بعض ایسے حقائق بیان کیے گئے ہیں جن کا انکشاف چٹانوں کے ذریعے ہوا ہے۔ طالب علموں کی آسانی کے لیے متعدد خاکے اور تصاویر بھی شامل کتاب ہیں۔

صفحات: 65، قیمت: -/21 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی

مدن لال کپور

# آرتھر ملر ــــ اپنے ڈراموں کے آئینے میں

گذشتہ چند مہینوں میں دنیا کے تین عظیم مفکر اور ادیب اس دنیا سے چل بسے جن میں ہندوستان کے نامور ناول نگار ملک راج آنند، فرانس کے عظیم مفکر ژاک دریدا اور امریکا کے عہد ساز ڈراما نگار آرتھر ملر ہیں۔ آرتھر ملر کا انتقال اس سال 10 رفروری کو ہوا۔ امریکا کے اس عظیم ڈراما نگار نے اپنے ڈراموں اور فن کے ذریعے امریکی عوام کی زندگی اور جذبات کی ترجمانی کی۔ امریکا کے محنت کش طبقے کے ترجمان اشتراکی ناول نگار ہاورڈ فاسٹ کی طرح وہ بھی امریکا کے سرمایہ دارانہ نظام اور حکومت کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کرتے رہے۔ ان پر کمیونسٹوں کی مدد کرنے کا الزام بھی لگایا گیا۔ اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے انھیں 1956 میں امریکا مخالف کاروائیوں کی تفتیش کرنے والی ایوان کی کمیٹی HUAC کے سامنے حاضر ہونا پڑا۔ ان پر جرمانہ لگایا گیا اور جیل کی سزا بھی سنائی گئی، لیکن امریکی عدالت نے اس فیصلے کو رد کردیا اور سزا کو منسوخ کردیا۔ امریکا کے دو نامور ڈراما نگاروں ایوجن اونیل (Eugene o' Neill) اور ٹینیسی ولیمز (Tennessee Willliams) کے فلسفیانہ اور نفسیاتی ڈراموں کے بالمقابل آرتھر ملر نے اپنے ڈراموں میں فرد اور سماج کے درمیان ٹکراؤ کو بڑی فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے اور انسان کے اخلاقی ضمیر کو بیدار کیا ہے۔ یہ ضمیر ناانصافی کی ہر بندش کو پاش پاش کردیتا ہے۔ اس کو نسل پرستی اور وطن پرستی کی دلفریب اور مضبوط دیواریں قید نہیں کرسکتیں۔ وہ اپنے ہی لوگوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوجاتا ہے جب وہ ان کے ہاتھوں حق اور انصاف کا خون ہوتے دیکھتا ہے تو جب ویت نام پر امریکی فوجیوں کے مظالم بڑھ گئے۔ اخلاقی ضمیر کی عکاسی کرنے والا یہ ڈراما نگار ادب اور فن (تھیٹر) کی دنیا میں ایک روشن مینار کی طرح کھڑا رہا تاکہ امریکی ضمیر مدہوشی اور نیند سے بیدار ہوسکے۔ اسی لیے چارلس ایشروڈ نے اس کے ڈراموں کو اخلاقی ضمیر کی شاعری کہا ہے۔

آرتھر ملر 17 راکتوبر 1915 کو نیویارک سٹی میں ہرلم کے مقام پر پیدا ہوا۔ یہ ایک خوبصورت علاقہ تھا جس کی آبادی جرمن، اطالوی اور سیاہ فام لوگوں پر مشتمل تھی۔ ملر کے والدین پولینڈ سے ہجرت کرکے امریکا میں آباد ہوئے تھے۔ ان کے والد کا کپڑے اور ملبوسات کا اچھا کاروبار تھا اور ان کا کنبہ مالی طور پر خوشحال تھا لیکن ان کا سب کچھ 1929 کی اقتصادی مندی کی نذر ہوگیا۔ بہت سے لوگوں کو اس مالی تباہی اور اس کے صدمے کا سامنا کرنا پڑا۔ ملر لکھتے ہیں کہ جس جگہ وہ رہتے تھے وہاں تین لوگوں نے اس مالی صدمے کی وجہ سے خودکشی کرلی تھی۔ یہ اقتصادی مندی ملر کے ڈراموں میں ایک ہیبت کی شکل میں موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''ذہن کے پیچھے یہ خیال ہمیشہ موجود ہے کہ ایک لمحے میں یہ سب کچھ ڈوب سکتا ہے۔ اس اقتصادی تباہی نے ملر کے تعلیمی سلسلے کو درہم برہم کردیا۔ کرسٹوفر بکس بائی لکھتے ہیں: ''خاندان کا کاروبار تباہ ہوچکا تھا۔ ملر کی امداد کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ چھوٹی چھوٹی نوکریاں کرکے اس نے یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے پیسہ جمع کیا۔ چار ڈالر فی ہفتہ کی اجرت پر روزانہ صبح چار بجے اس نے ایک بیکری کی بریڈ یعنی روٹیاں بانٹنے کی نوکری کی۔'' بکسبائی مزید لکھتے ہیں ''مشیگاں یونیورسٹی جہاں ملر پڑھتے تھے، اپنے طلبہ کے انقلابی ذہن اور شعور کی وجہ سے پہچانی جاتی تھی۔ وہاں ملر نے اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ مل کر ایک اخبار شروع کیا۔ اس کے پانچ دوست ہسپانوی خانہ جنگی میں لڑنے کے لیے بھرتی ہوگئے جن میں سے ایک لڑائی کے میدان میں مارا گیا اور ایک بری طرح زخمی ہوا۔ ملر کے دل میں بھی محاذ جنگ پر جانے کا ارمان تھا لیکن امریکا کی صورت حال نے اسے اسپین جانے سے روک دیا۔ ڈیٹرایٹ میں ہنری فورڈ نے اپنا کارخانہ چلانے کے لیے نازی سپاہیوں کو ملازم رکھ لیا۔ ملر نے کہا'' اسپین ڈیٹرایٹ میں موجود ہے۔'' اس کے انقلابی اور ترقی پسندانہ نظریات نے اس سے کئی ڈرامے لکھوائے جو امریکی عوام میں بہت مقبول ہوئے اور ان کو انعامات سے بھی نوازا گیا۔

جوزف میکارتھی امریکن اشتراکیوں اور ان کے حمایتیوں کے سخت دشمن تھے اور ان کو ختم کرنے کا مصمم ارادہ رکھتے تھے۔ میکارتھی کی دھمکیوں اور زیادتیوں کی وجہ سے ملر کے ڈراموں کے تماشائیوں کی تعداد اور حاضری پر برا اثر پڑا اور وہ کم ہوگئی۔ ڈراما گروپ کی آمدنی کم ہوگئی۔ ڈرامے میں کام کرنے والے اداکاروں اور فن کاروں نے اپنی تنخواہ میں کٹوتی کو بخوشی قبول کیا اور انقلابی فکر کی مشعل کو بجھنے نہیں دیا۔ اس رات جب ایتھل اور جولیس روزن برگ کو کمیونسٹ مخبر ہونے کے الزام میں پھانسی پر چڑھایا گیا تو ملر کے ڈراما شو کے تماشائیوں اور اداکاروں نے کچھ منٹ خاموشی اختیار کرکے شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کیا۔ پھر ملر ان صحافیوں کی اس جماعت میں شامل ہوگئے جس کا مقصد میکارتھی کے خلاف لکھنا تھا لیکن امریکا کا کوئی بھی اخبار ان کے مضامین اور مقالات کو چھاپنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ملر نے ویت نام جنگ کے خلاف آواز بلند کی۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں: ''ویتنام کی جنگ ایک مجرمانہ کاروائی تھی جس نے امریکی تہذیب کے ایسے پہلو کو پیش کیا جس کے بارے میں سوچنا پسند نہیں کروں گا۔''

ملر اپنی خودنوشت سوانح حیات میں اپنے معاصر اور ہم عہد ہونے کی صلاحیت کا مثبت انداز سے ذکر کرتے ہیں، اور ہرعبوری دور میں شرکت کرنے

کے آرزومند نظر آتے ہیں۔ ان کا نعرہ تھا: ''تغیر ہمارا پیدائشی حق ہے۔'' ملر کے مطابق فنکار اور ادیب کا کام ہے کہ وہ لوگوں کو وہ یاد دلائے جس کو انھوں نے بھولنا چاہا ہے۔ ''ملر کے لیے ماضی نہایت مقدس ہے۔'' ظلم اور ناانصافی کے خلاف جنگ کا بیتا ہوا ہر لمحہ جدوجہد کے آنے والے ہر پل کو تقویت بخشتا ہے۔ ملر اپنے دو مشہور ڈراموں ''سیلز مین کی موت'' (The Death of a Salesman) اور ''زوال کے بعد'' (After the Fall) میں ماضی اور حال کو اکٹھا کر دیتے ہیں کیونکہ ''جس ماضی کو ہم اپنے ذہن اور شعور میں اٹھائے ہوتے ہیں وہی ہمارے حال کا مواد ہے۔''

ملر کا مشہور ڈراما ''کروسیبل'' (Crucible) امریکا میں اسٹیج ہونے کے تیس سال بعد کمیونسٹ چین میں دکھایا گیا۔ ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ''سب میرے فرزند'' (All my sons) میں ذاتی مفادات کی خاطر سماج کو نقصان پہنچانے کی ذہنیت پر کاری ضرب لگائی گئی۔ ''سیلز مین کی موت'' (Death of Salesman) ان کا شاہکار ڈراما ہے۔ اس ڈرامے میں ایک عام شہری کو المیاتی ہیرو کے طور پر پیش کیا گیا۔ یہ امریکی دانشور طبقے کو چونکا دینے والی بات تھی۔ ہندوستانی فلم اور تھیٹر کی اہم شخصیت فیروز خاں نے ملر کے ڈرامے ''ڈیتھ آف اے سیلز مین'' کو ہندوستانی روپ دیا، اور اسے ''سیلز مین رام لال'' کے عنوان سے اسٹیج پر پیش کیا، جو لوگوں میں بہت مقبول ہوا۔ فیروز خاں کے مطابق: ''ایک طویل عرصے سے تھیٹر نے راجاؤں، ان کی رانیوں اور سرداروں کے المیے اسٹیج پر پیش کیے، لیکن ملر نے ایک عام آدمی یعنی ایک سیلز مین کی زندگی کے المیے کو اپنے ڈرامے میں اہم مقام دیا۔'' اس نے ولی لومان کے کردار کو شاہکار بنا دیا۔ ملر کے اس عظیم ڈرامے نے تین ممتاز انعامات حاصل کیے۔ پلٹیزر انعام، نیو ڈراما کریٹک سرکل ایوارڈ اور ٹونی ایوارڈ اس وقت ملر صرف 33 سال کے تھے۔ ملر کے اس شاہکار ڈرامے کا المیاتی ہیرو ولی لومان امریکی معاشرے کی اس فلاسفی میں یقین رکھتا ہے کہ دنیا میں کامیابی کا راز انسان کی بیرونی جاذبیت، اس کے پُرکشش اطوار، اہم لوگوں سے خوشگوار تعلقات قائم کرنے کا فن اور اس کی ظاہری مسکراہٹ میں چھپا ہے۔ ملر کامیابی کے اس فارمولے کو ''عظیم امریکی خواب'' (Grand American Dream) کا نام دیتا ہے۔ امریکی معاشرے کا ہر فرد یہی خواب دیکھ رہا ہے۔ ولی لومان وگنر کمپنی کو کامیاب بنانے میں اپنی عمر کے 34 سال صرف کر دیتا ہے، لیکن اس کے عمر رسیدہ ہونے پر کمپنی کا مالک ہاورڈ اسے ملازمت سے برطرف کر دیتا ہے کیوں کہ وہ کمپنی کے لیے زیادہ منافع کمانے کے قابل نہیں رہا۔ اس صورتِ حال نے ڈرامے کے ہیرو ولی لومان کو خودکشی کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ ملر کے ایک اور مشہور ڈرامے ''سب میرے فرزند'' (All my sons) کا اہم کردار ہوائی جہازوں کے پرزے بنانے کا کاروبار کرتا ہے اور ناقص پرزے بنانے سے گریز نہیں کرتا۔ لیکن وہ محتاط رہتا ہے کہ اس کا کوئی قریبی رشتے دار ان جہازوں میں سفر نہ کرے۔ زیادہ منافع کمانے کی ہوس میں اپنی سماجی ذمے داری کو نظر انداز کرنا معاشرے کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔ ملر کے مطابق ایسا کرنا اپنے بھائی کو فروخت کرنا ہے، اور بھائی کو فروخت کرنا اپنے کو فروخت کرنا ہے۔

ملر اپنے ڈراموں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میرے ڈرامے میری خودنوشت سوانح حیات ہیں۔ میں ایسے ڈرامے نہیں لکھ سکتا جو یہ نہ بتاتے ہوں کہ ان میں میں کہاں ہوں۔ میں ان سب میں ہوں، میں نہیں جانتا کہ اس کے علاوہ کیسے لکھا جا سکتا ہے۔''

□□□

B1/415, Janakpuri, New Delhi-56


**دل کی گیتا**

**مدوّن: مخمور سعیدی**

''شریمد بھگوت گیتا'' ہندستان کا وہ الہامی صحیفہ ہے جس کے ترجمے دنیا کی کئی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ اردو میں بھی اس کے تراجم ہوتے رہے ہیں لیکن خواجہ دل محمد کا یہ ترجمہ گیتا کا بہترین ترجمہ ہے جو اردو نظم میں کیا گیا ہے۔ ترجمے میں بہت سے مقامات پر کثیر المعانی الفاظ آئے ہیں، خواجہ صاحب نے ایسے تمام مقامات پر حاشیے میں وہ معنی درج کر دیے ہیں جو وہاں مطلوب ہیں۔ جہاں جہاں ضروری سمجھا ہے حواشی میں مطالب کی تفسیر و توضیح بھی کرتے گئے ہیں۔

صفحات: 240، قیمت: -/92 روپے

**یونانی ادویۂ مفردہ**

**مصنف: حکیم سید صفی الدین علی**

طب یونانی میں دو طرح کی ادویہ استعمال کی جاتی ہیں، مفرد اور مرکب۔ اگر طبیب مرض کی علامات کی بہتر تشخیص کر لے تو مفرد ادویہ کے ذریعے بڑی آسانی سے علاج کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکیموں نے مرکبات کی بجائے مفردات کے استعمال پر ہمیشہ زور دیا ہے۔ اس کتاب میں 334 ادویہ کی تفصیل درج کی گئی ہے جس میں مختلف فواکہات اور میوہ جات سے لے کر انواع و اقسام کی جڑی بوٹیاں اور پودے بھی شامل ہیں۔

صفحات: 365، قیمت: -/70 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

ویسٹ بلاک-1، وِنگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

بیگم دختر جہاں

# فرانسو ــــ اردو زبان کا جرمن شاعر

اردو زبان کی عالمگیر شہرت اور اہمیت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ اس زبان کے چاہنے والوں میں ہر قوم، ہر ملک اور ہر نسل کے لوگ شامل ہیں۔ مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور دیگر ہندوستانیوں کے ساتھ ساتھ ترکوں، مغلوں، یہودیوں، پرتگالیوں، انگریزوں نے بھی اس کی آبیاری میں حصہ لیا ہے۔ یہ سبب تھا اردو کی فطری کشش، رنگینی، گہرائی اور گیرائی کا۔ کہا جاتا ہے کہ یورپ کی جو قوم ہندستان میں داخل ہوئی تو ہماری تہذیب و تمدن کو دیکھ کر اس کی شیدائی بن گئی۔ گلشن بے خار اور تذکرہ کریم الدین سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کے شیدائی الیگزینڈر ہیڈرلی آزاد، سوبر، اسیر، شور اور فرانسو انھی لوگوں میں سے تھے جنھوں نے عمر بھر اردو زبان میں ہی مشق سخن کی۔ ان میں سے بہت سے لوگ اپنی تصانیف یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ یہ وہ قابل قدر ادبی شخصیتیں تھیں جنھوں نے دنیا کو یہ بتا دیا کہ ہندوستان کے باہر علما اور فضلا ہماری زبان اور ادب کو سیکھنا باعث فخر سمجھتے تھے۔

جرمن نسل کا اردو شاعر فرانسو شاہ نصیر کا شاگرد تھا۔ اس نے اردو میں جو کارنامے انجام دیے ہیں ان کا ذکر ہماری خاص توجہ کا مستحق ہے۔ پروفیسر احتشام حسین نے لکھا ہے کہ فرانسو کا نام فرانسو گاڈلیو کونس تھا اور والد کا نام جان گاڈلیو کونس تھا۔ اس نے ایک فرانسیسی عورت سے شادی کی تھی جس کے بطن سے فرانسو پیدا ہوا۔ فرانسو نے اپنی تاریخ ولادت 15/مارچ 1777 لکھی ہے۔ وہ شاہجہاں آباد میں پیدا ہوا۔ 1857 کے غدر میں فرانسو کو بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا جس کا حال خود فرانسو نے اپنی مثنوی ظفر الظفر میں (فارسی) میں لکھا ہے۔ شور میرٹھی فرانسو کا نواسہ تھا اور اردو میں مہارت رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کی مثنوی ''دہلی مرحوم'' سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ فرانسو نے اپنی کتاب ''مسرت افزا'' کے دیباچے میں لکھا ہے:

تجھ کو ہے شاید فرانسو فیض اصلاح نصیر
شاعران شہر میں تو اہل دیواں بن گیا

حقیقت یہ ہے کہ فرانسو صرف شاعر ہی نہیں تھا وہ اردو لسانیات کا بھی ماہر تھا۔ اس نے اردو کی ضخیم لغات لکھیں۔ اس نے افسانے بھی لکھے اور انشا پردازی کے بھی نمونے یادگار چھوڑے۔ پیارے لال شاکر میرٹھی نے اپنے مضمون ادبی دنیا کے سالنامے 1939 میں ان کا ذکر کیا ہے۔ فرانسو کی کتابوں پر مشتمل ان کی فہرست مندرجۂ ذیل ہے۔

1. نظم انشا مسمّی بہ نسیم دلکشا۔ منظوم رقعات
2. مجموعۂ قصائد
3. دیوان ہجویات
4. مجموعہ مثنویات (کشش عشق، چراغ خانہ، عشق، گلشن عشق، مطلع نور، افراط نشاط، سرنامہ ایام، آتش سود اندوہ ربا، دشت عبرت، شمع انوار، عالم شوق، سرمایۂ بہار، مجموعۂ استہزا، تنبیہہ الغافلین)
5. نظم وقطعات
6. مثنوی ظفر الظفر فارسی
7. دیوان فارسی
8. دیوان ہزلیات
9. دیوان غزلیات
10. قصیدہ مبارکباد فتح
11. دیوان کتب خانہ لالہ سری رام
12. مسرت افزا (مختصر لغت اردو)
13. لغات اردو مفصل
14. دیوان اردو
15. کتاب مراۃ حسن وعشق
16. گلبن تمنا (اردو زبان میں فن انشا)
17. عشق افزا (افسانہ اردو)
18. عشرت النسا (اس میں ہندوستان کے صوبوں کی عورتوں کے حسن کی تعریف کی گئی ہے۔)
19. لغات مفصل (ایک مثنوی ''آرام جاں'')
20. گلزار ہفت خلد کے نام سے منظوم تصنیف

فرانسو کی لغات اگرچہ اس دور کی اولین لغات میں سے ہیں تاہم ان کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے یورپین لوگوں کو ہندوستانی زبانوں کی تحقیق سے بڑی دلچسپی تھی فرکسن کی لغت 1773 گلیڈون کی قانونی اصلاحات -1797، گلکرائسٹ کی لغات 1798، شیکسپیئر کی لغات 1817، ایلیٹ کی لغت 1845 اور فوربس کی ہندوستانی لغت 1848، اس بات کی شاہد ہیں۔ (مسرت افزا، دراصل فرانسو کی لغت ہے جس میں اس نے

اپنے اشعار بطور سند پیش کیے ہیں مثال کے طور پر پتا، پٹا، چتر چتر

چکیاں چل جائیں سر پر تو بھی بیداری نہ ہو
آہ کیا پتھر پڑے بندی اثر پر ان دنوں

پرکالہ

جلوۂ حسن جہاں سوز دکھا کر مارا
کیسا پر کالۂ آتش نے جلا کر مارا

فرانسو کو مفتیوں، قاضیوں اور ملاؤں کی کہانیوں سے خاصی دلچسپی تھی۔ جنسی اور شہوانی قسم کے لطیفے بھی کتاب میں ہیں۔

فرانسو اپنے مذہبی اعتقادات میں بہت پختہ ہے۔ اسلام اور عیسائیت کے مقابلے میں مسیحیت کی حمایت کرتا ہے۔ اسلام اور قرآن پر حملہ اور اعتراض کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔

فرانسو کو شعرائے فارسی کے کلام پر بڑا عبور تھا۔ فردوسی، انوری اور خاقانی سے لے کر متوسطین و متاخرین تک سب کے اشعار پیش کرتا ہے۔ اشعار کا انتخاب بڑا عمدہ اور حسب موقع و محل ہے۔ یہ تصنیف نثر میں ہے اور دیوان فرانسو کے نسخۂ اول میں ہے۔ ایک رسالہ "گلدستۂ حسن و عشق" ہے۔ دیوان سے اس کا خط بھی مختلف ہے۔ اس میں فرانسو نے اپنی جدت طبع کا ثبوت دیا ہے اس کو بیاض کہا جاسکتا ہے۔ اس میں اردو کے اشعار بھی نہایت دل پسند و دل نشیں ہیں۔ گلبن تمنا (جلد نہم از جام جہاں نما) بھی فرانسو کی ہی کتاب ہے۔ "ربِ میر" بسم اللہ الرحمن الرحیم، وتمت بالخیر سے پہلے روح القدس اس کی مسیحیت کی دلیل ہے۔ اگر چہ وہ مسلمانوں کے گہرے معاشرتی اثر سے متاثر ہے لیکن پکا مسیحی ہے۔

فرانسو کے "افسانے" "مہ جبیں و ماہ طلعت" کو پرانے طرز کی عشقیہ کہانی کہا جاسکتا ہے۔ اس میں نثر کے ساتھ ساتھ بکثرت اردو کے اشعار دیے گئے ہیں۔ اسلوب پر تکلف ہے۔

رسالہ درصفت زیاں (عشرت النسا)۔ بظاہر یہ نسخہ فرانسو کا خود نوشتہ معلوم ہوتا ہے۔ ہر صفحے میں دو کالم ہیں۔ ایک کالم میں نثر ہے اور دوسرے میں غزلیات۔ اس دیوان کی ترتیب میں بھی فرانسو نے بڑی جدت سے کام لیا ہے۔ یہاں اس نے غزلیات کو عام دستور کے مطابق ردیف کے حروف کے اعتبار سے مرتب کرنے کے بجائے قافیہ کے حروف کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ دیوان میں بعض موقعوں پر غزل سے پہلے ان قوانی کی ایک فہرست دے دیتا ہے جن کا استعمال وہ غزل میں کرتا ہے جیسے الگ، اور نگ، آہنگ، ترنگ، پلنگ، دبنگ، جنگ، رنگ وغیرہ۔

اس کے دیوان میں سہ غزلے یا اس سے زیادہ ہم مطلع غزلیں ملتی ہیں۔ فرانسو اس زمانے کا شاعر ہے جب دہلی کے مشاعروں میں شاہ نصیر اور ان کے معاصرین سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے جس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہوتا تھا کہ شاعر کو زبان دبیان، قافیہ ردیف پر دسترس حاصل ہے۔ فرانسو کے یہاں 17 اور 22 اشعار کی غزلیں موجود ہیں۔ اگر چہ فرانسو کی شاعری عام ہے لیکن اس لحاظ سے خاص ہے کہ لکھنے والا پولینڈ کا باشندہ ہے۔ وہ اردو اور فارسی کے مخصوص پیرایۂ بیان سے کس درجہ آشنا ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کی ایک غزل کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہے چشم تر آب رواں کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے
ہووے کسی کو کچھ گماں کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے
کوئی دم کے ہیں ہم مہماں کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے
ہے ہر نفس رنگ رواں کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

□□□


**مسدود راہیں**

**ترجمہ اور تعارف: زاہدہ زیدی**

ان پانچوں ڈراموں کا شمار جدید مغربی تھیٹر کے اہم ترین فن پاروں میں ہوتا ہے۔ ہمہ گیر وژن، فنی ندرت اور گہری معنویت کے حامل یہ ڈرامے قبول عام کی سند حاصل کرچکے ہیں۔ ان کے مصنفین ہیں یوجین ایونیکو، مینول دی پیدرولو، ژاں پال سارتر اور سیمول بیکٹ۔

(پہلا ایڈیشن)، صفحات: 406، قیمت: 126.00 روپے

**اردو زبان کا جادو (حصہ اول، دوم)**

**مرتبین: مسز پی. شیاملا کماری**
**پروفیسر ماہ جبیں نجم**

اردو سکھانے والی دو آسان کتابیں

جو تدریس زبان کے جدید سائنٹفک اصولوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہیں۔ یہ کتابیں بچوں کے ساتھ ساتھ اردو سیکھنے والے بالغوں کے لیے بھی کارآمد ہیں۔

(حصہ اول، قیمت: 43 روپے)، (حصہ دوم، قیمت: 46.00 روپے)

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

سید محمد عمیر ندوی

# قومی اردو کونسل کا فنکشنل عربی کورس

نصاب تعلیم کا بنیادی عنصر ہے، اس سے نہ صرف تعلیم کے معیار کو پرکھا اور قائم کیا جاسکتا ہے، بلکہ اچھے نتائج تک پہنچا جاسکتا ہے اور مقصد کو بھرپور طریقے پر حاصل کیا جاسکتا ہے، زمانے کے چلن اور عصری تقاضوں کے پیش نظر اس کی تیاری اور تعلیم و تدریس میں تبدیلیاں بھی کی جاتی ہیں، لیکن بنیادی طور پر جو بات ذہن سے کبھی نہیں نکلتی وہ یہ کہ موضوع کے حوالے سے طالب علم کو جو کچھ سکھاتا ہے اس میں کسی طرح کی کمی نہ ہو۔ طالب علم کو کم سے کم وقت میں بہتر طریقے سے معلومات فراہم کی جائیں اور زبان و بیان کے لیے اچھے اسلوب کا استعمال کیا جائے، کبھی کبھی ایک اضافی چیز طالب علم کو حاصل ہوتی ہے جس کا سہرا نصاب تیار کرنے والوں کے سر بندھتا ہے یعنی طالب علم کے ذہن کو بیدار کرنا، حافظے کو تازہ رکھنا اور اصل تعلیم کے ساتھ طالب علم اور استاد دونوں کے لیے اسلوب اور بیان کے حوالے سے دلچسپی پیدا کرنا مثلاً تاریخ کے نصاب میں اچھی اور فصیح زبان کا استعمال ایک الگ چاشنی پیدا کرتا ہے اور طالب علم اور استاد دونوں کا دل اس کتاب میں لگتا ہے، اسی طرح فقہ اور حدیث کے نصاب میں فصیح اور سہل زبان کا استعمال کتاب کے اسرار و رموز کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے اور طالب علم کے لیے جاذبیت پیدا کرتا ہے، تفسیر کے نصاب میں تاریخ اور جغرافیہ کا حوالہ جو کہ طالب علم کو ادب اور لغت کے "حل مشکلات" سے نکال کر ایک نئے موضوع کے ساتھ جوڑ دے، نئے میدان اور نئی معلومات کے دروازے اس کے لیے کھول دے تو یقیناً طالب علم زیادہ وقت دینے سے نہیں کترائے گا، اور موضوع کی خشکی اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔

فنکشنل اور عملی تعلیم میں عام طور سے تھیوری اور طریقے کو سمجھانے کی کوشش ہوتی ہے اور زیادہ تر تمرینات اور تدریبات پر توجہ دی جاتی ہے کہ طالب علم دو چیزوں کو جوڑ کر ایک چیز بنانے پر عملی قدرت حاصل کرلے، لیکن تھیوری، طریقے اور سوال و جواب کی ترتیب سے وہ ایک اضافی اور نئی معلومات خاص طور پر تاریخی و اخلاقی نوعیت کی معلومات حاصل کرسکے، ایسا عموماً نہیں ہوتا۔ زبان سکھانے کے لیے الفاظ و تراکیب پر ہی زور دیا جاتا ہے، لیکن قومی اردو کونسل نے فنکشنل عربی کورس کا خاکہ جس انداز میں تیار کیا ہے وہ صرف زبان سکھانے تک محدود نہیں ہے بلکہ طلبہ کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ بول چال کی عربی پر اس قدر عبور حاصل کرلیں کہ اس کی بنا پر وہ کہیں بھی نوکری یا خود روزگار حاصل کرنے کے قابل ہوکر اپنا مستقبل بہتر بناسکیں۔

کونسل کے فنکشنل عربی کورس، سال آخر کے نصف اول کے نصاب میں پانچویں اور چھٹی کتاب کی کاپیاں جانچتے وقت شدت سے اس بات کا احساس ہوا اور پھر کتاب کے ساتھ کاپی کا ایک نئے زاویہ سے مطالعہ کیا تو اپنے خیال کی تائید ہوئی۔

زیر مطالعہ کتاب "اللغة العربیة الوظیفیة" آٹھ وحدات میں ہے۔ کتاب کیا ہے، اس کے مشمولات و مندرجات کیا پیام دیتے ہیں، اس کے اندر کن اصول و مبادی کو جگہ دی گئی ہے تمام کا تذکرہ اور پھر تبصرہ ایک مستقل موضوع اور کام ہے، طوالت کے خوف سے صرف پانچواں اور چھٹا حصہ پیش نظر ہے۔ اس جلد کے پہلے وحدے میں تہذیب و تمدن، صحت و تندرستی، علم اور سائنس کے متعلق پر مغز مفصل معلومات ہیں جو طلبہ کے ذہن کو معلومات کا گنجینہ بنانے کے ساتھ بحث و تحیص کا مزاج پیدا کرتی ہیں۔ اس کے نمایاں عناوین حب الوطن، اوقات الفراغ، المعملة التجاریة، الغذاء الصحی، القراءة الصحیة، حریق النهر با، العلم یکتشف ہیں، جبکہ دوسرے وحدے کی سرخیاں کچھ اس طرح ہیں، المدارس، عشر وصایا للنجاح، ابلیس یتصر، صحة البیئة، مکانة امرائة، هجرة القدس، التبادل الحضاری۔ دوسرا وحدہ ثقافتی تقاضوں کے تحت مرتب کیا گیا ہے، ان عناوین کے سرسری مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ ان دروس اور اسباق میں فلسفۂ عمرانیات کی روح پورے طور پر نمایاں ہے۔

ماہرین نصابیات نے اسلامی زبان و ادب کے فروغ کے لیے کچھ رہنما اصول مرتب کیے ہیں مثلاً:

1. زبان ادبی پیرایۂ بیان میں قرآن و حدیث کا معنوی و ظاہری جمال لیے ہوئے ہو۔
2. نئے کلمات اور نئے موضوعات کے الفاظ کا استعمال ایک خاص کالم میں رکھ کر کیا گیا ہو۔
3. عربی مفردات کے تکرار سے احتراز نہ ہو، (کیونکہ یہ طریقہ بچوں کے لیے بہت مفید ہے) موضوعات اور عناوین کے انتخاب میں تنوع ہو۔
4. دروس اور اسباق میں اخلاقیات کا پہلو نمایاں اور غالب ہو، دینی روح

بھی ساتھ چھوڑتی نظر نہ آئے، ان چھ نکاتی اقوال کا خلاصہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عربی زبان و ادب سے متعلق کوئی کتاب ان اصول کی رہنمائی میں تیار کی جاتی ہے تو وہ قابلِ قبول ہونے کے ساتھ ساتھ طلبہ اور نئی نسل کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگی۔ ضوابط کی رعایت کے ساتھ تاریخی حقائق، علمی دقائق اور سائنسی تجربات کی گرہ کشائی بہت ہی شستہ الفاظ اور رواں اسلوب میں کی گئی ہے۔ اس کتاب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر سبق کے بعد سوال و جواب، خالی جگہوں کو پُر کرنے، جملے اور اچھے کلمات کو اسی وزن پر ڈھالنے کا گر سکھایا گیا ہے۔ مزید مشق و تمرین کے لیے ایسے علمی مباحث دیے ہوئے ہیں کہ طلبہ بآسانی عربی زبان کو حرزِ جاں بنالیں، بلکہ ذوق و شوق کے ساتھ اس کے پروگراموں میں حصہ لیں۔

عربی زبان کی تدریس و تعلیم کا یہ طریقہ ایک نیا باب اور نئی تاریخ مرتب کرتا ہے۔ اس کتاب کے پہلے وحدے کا پہلا درس "حب الوطن" ہے۔ ہر انسان کو اپنے وطن سے فطری لگاؤ ہوتا ہے۔ جس ماحول میں انسان پروان چڑھتا ہے اس کی فضا اور اس کا ماحول اسے بے حد عزیز ہوتا ہے۔ اسی فطری جذبے کے تئیں حضرت محمدؐ نے فرمایا تھا "حب الوطن من الایمان" یعنی وطن کی محبت ایمان کی نشانی ہے یہ مضمون مکالماتی انداز میں پیش کیا گیا ہے، اور وطن کی محبت کے عقلی و فکری دلائل بھی دیے گئے ہیں۔ دوسرے وحدے کا پہلا سبق "المدارس" ہے۔ اس طرح کے اسباق کا مطالعہ مدارس کی علمی اہمیت و افادیت کے پیشِ نظر نئی نسل کا اعتماد بحال کرتا ہے۔ اس درس کو بھی منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اختبارات کے عنوان سے ان کتابوں کے امتحان کے لیے جو کاپی مرتب کی گئی ہے وہ صرف جزوی سوالات پر مبنی نہیں ہے، بلکہ پوری کتاب کی فہرست اور داخلی مواد کا احاطہ کرتی ہے۔ کوئی طالب علم بغیر مطالعے کے ان کو حل کرنا چاہے گا تو اسے مشکل ہوگی، اس ذیل میں عربی اردو ترجمہ کے لیے جو عبارتیں لکھی گئی ہیں وہ دیومالائی تہذیب کی داعی نہیں ہیں بلکہ تاریخ کی گمشدہ کڑیاں ہیں جن کو تلاش بسیار کے بعد یہاں جگہ دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیں:

(1) "خلیفہ منصور عباسی کے زمانے میں ہندوستانی دانشوروں کا ایک وفد بغداد گیا تھا، جس میں ریاضیات کا ایک بڑا عالم گنگا (کنکا) بھی تھا دیگر اسکالر کے نام منکھل اور مانک تھے، جن کے ذریعے عربی زبان میں ہندوستانی علوم کے دروازے کھلے۔"

(2) "اہلِ مغرب نے اندلس کے اساتذہ کا لباس اپنایا ہے، یہ وہی لباس ہے جو خصوصی تعلیمی مواقع پر آج بھی یورپ کی یونیورسٹیوں میں رائج ہے۔"

(3) "مغرور انسان دوسروں کی نظروں میں عموماً ناپسندیدہ ہوتا ہے اور اس کے دوست بھی کم ہوتے ہیں۔" (اختبارات 42-43)

الغرض فنکشنل عربی کی تعلیم و تدریس کا یہ نصاب محبانِ عربی زبان و ادب کے لیے ایک قیمتی سوغات کی حیثیت رکھتا ہے اس کا مطالعہ جہاں ایک طرف قدیم عربی سے واقفیت بہم پہنچاتا ہے، وہیں دوسری طرف جدید عربی سے بھی قارئین کے رشتے کو مضبوط کرتا ہے۔ عربی زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں اور اس کے پڑھنے پڑھانے والوں کے لیے قومی کونسل کا یہ ایک گراں قدر تحفہ ہے جس سے خاطر خواہ استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

□□□

Maktaba Hira, Nadva Road,
Lucknow


**اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ**

پروفیسر محمد حسن

ادبی سماجیات ایک نئے علم کی حیثیت سے حال ہی میں سامنے آئی ہے۔ یہ کتاب اردو میں ادبی سماجیات کے مطالعے کی پہلی کوشش ہے جو اس کے تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔

پہلی اشاعت

334 صفحات، قیمت: 98.00 روپے

**اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان**

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

مصنف برسوں تک آل انڈیا ریڈیو میں ذمے دارانہ عہدوں پر رہے ہیں، انھوں نے باریک بینی کے ساتھ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی زبان پر گفتگو کی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے قلم کاروں کے لیے یہ کتاب خصوصی افادیت رکھتی ہے۔

پہلی اشاعت

646 صفحات، قیمت: 200.00 روپے

**اردو ڈراموں کا انتخاب**

مرتب: پروفیسر محمد حسن

1947ء سے 1990 تک اردو میں لکھے جانے والے ڈراموں کا ایک نمائندہ انتخاب جن میں تاریخی، نیم تاریخی، سماجی اور سراسر تخیلی ڈرامے بھی شامل ہیں۔ ابتدا میں فاضل مرتب نے ڈرامے کے فن اور اس کی روایت پر بھرپور گفتگو کی ہے۔

پہلی اشاعت

600 صفحات، قیمت: 156.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

محمد خلیل

# آئنسٹائین کے نظریے کے سو سال

آئنسٹائین کے نظریۂ اضافیت اور اس کا عملی مطلب کیا ہے۔ اس کا تعلق ایک طرف زمین کی کششِ ثقل سے ہے اور دوسری طرف کائنات سے اور ساتھ ہی ایک ذرّے کی اندرونی دنیا سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ آئنسٹائین نے کششِ ثقل کے بارے میں نیوٹن کی پہلی دریافتوں میں بڑا اضافہ کیا۔ وقت کو کسی بھی پیمائش میں ایک لازمی عنصر (ایلمنٹ) کے طور پر داخل کیا اور ثابت کیا کہ مادّے کی مقدار رُکی اور حرکت کی حالت میں ایک جیسی نہیں رہتی اور اس کی رفتار کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ اگر رفتار روشنی کی رفتار کے برابر ہوجائے تو یہ مقدار لامحدود ہوجائے گی۔ مادّے اور توانائی میں مستقل تعلق قائم کرنا آئنسٹائین کا ایک اہم سائنسی کارنامہ ہے۔ یعنی مادّہ توانائی کی انتہائی مرتکز شکل ہے ایک گرام مادّہ (یورینیم) تقریباً 90 لاکھ توانائی کے برابر ہے۔ اسی نظریے میں ایٹم کی توانائی کا راز پوشیدہ ہے۔ اگر ایٹم جو بہت چھوٹا ذرّہ ہے منتشر کیا جائے تو توانائی کے نکلنے کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ اس طرح اس نظریے نے سورج سے توانائی کے مسلسل اخراج کا معمہ حل کردیا۔ اگر سورج جلتا رہتا اور لکڑی جیسے کسی بھی ایندھن کی طرح اس کے جلنے سے حرارت پیدا ہوتی (جیسا کہ ماضی میں لوگ سوچتے تھے) تو بہت پہلے ہی اس کو جل کر ختم ہونے والا ذریعہ ہی فراہم نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ کائنات کے کئی پوشیدہ رازوں سے بھی پردہ اٹھایا جس کے ذریعے خلائی تحقیق میں تیزی پیدا ہوئی۔

نظریۂ اضافیت کی مدد سے کششِ ثقل کا جامع اور صحیح اصول واضح کیا گیا جس کے ذریعے سیارہ مریخ اور عطارد کی گردش اور مدار کی مکمل توجیہہ ممکن ہوسکی۔ اضافیت سے متعلق آئنسٹائین کے دو نظریے بہت مشہور ہیں ایک خاص نظریۂ اضافیت اور دوسرا عام نظریۂ اضافیت۔ پہلے میں حرکت اور رفتار کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کائنات میں کہیں بھی کوئی ایسا مقام نہیں جو قطعی غیر متحرک اور مستقل ہو تاکہ اس کے حوالے سے کسی متحرک نظام کی مطلق رفتار و حرکت معلوم کی جاسکے۔

ہم اس بات سے واقف ہیں کہ ہماری زمین سورج کے گرد بیس میل فی سیکنڈ کی رفتار سے گردش کررہی ہے۔ بدلتے ہوئے موسم اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لیکن چار سو سال پہلے لوگ یہی جانتے تھے کہ سورج زمین کے گرد گھوم رہا ہے اور اسی بنیاد پر اُس زمانے کے فلکیاتی سائنسدانوں نے ایسے عملی طریقے ایجاد کرلیے تھے جن سے وہ ستاروں، سیاروں کے بارے میں صحیح پیشین گوئی کرسکتے تھے۔ لیکن اب یہ غلط ثابت ہوچکا ہے کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔ اس ثبوت کے باوجود بھی کہ زمین گردش میں ہے اس کا عملی مشاہدہ پیش نہیں کیا جاسکا اور نہ اس کی مطلق گردش کی رفتار معلوم کی جاسکتی ہے۔ جو کچھ اب تک حاصل ہوسکا ہے۔ وہ اعتباری ہے۔

اپنے اس نظریے کے بعد آئنسٹائین نے مزید تحقیق کی کہ کیا واقعی بغیر کسی حوالے کے خود متحرک نظام کی اپنی حرکت سے اس کی مطلق رفتار معلوم نہیں کی جاسکتی مثال کے طور پر ایک شخص ایک مستقل کم رفتار چلتی ٹرین پر سوار ہے، اس کے اندر وہ اُس کی حرکت معلوم کرنے کے لیے تجربہ کرتا ہے تو کیا وہ اس کی حرکت معلوم کرسکتا ہے۔ نہیں تا وقتیکہ باہر کی کسی شے کو بطور حوالہ نہ مان لے۔ یہ رفتار بھی اعتباری ہوگی۔ غرض یہ کہ مطلق رفتار نہیں معلوم کی جاسکتی۔ اس طرح ممکن ہے اگر ڈرائیور اچانک بریک لگا دے پھر وہ جھٹکا محسوس کرے گا اس وقت اس شخص کو ٹرین کی حرکت اور رفتار کی تبدیلی کا علم ہوگا یا پھر جب ریل کہیں مڑ رہی ہو تو اُس وقت بھی وہ شخص یہی محسوس کرے گا کہ گاڑی حرکت میں ہے اور ساتھ ہی ساتھ اُس کا جسم باہر کی جانب کھچاؤ سے خود بخود اس کی مزاحمت کی کوشش کرے گا۔

اس سے نتیجے کے طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ساری کائنات میں ایک ہی شے ہو مثلاً ہماری زمین۔ اگر اچانک اس کی گردش میں تبدیلی پیدا ہوجائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ زمین حرکت میں تھی۔ دوسرے یہ کہ تنہا ہونے کی وجہ سے خلا میں اس کی مطلق رفتار معلوم کی جاسکتی ہے اور تیسرے یہ کہ ناہموار حرکت جو کسی قوت یا بتدریج بڑھتی ہوئی رفتار کی پیداوار ہو وہ مطلق ہوسکتی ہے۔ لیکن کائنات میں ایسا کوئی منفرد نظام نہیں ہے جو کسی مطلق حالت کی نشاندہی کرسکے۔ اس لیے آئنسٹائین نے اپنے عام نظریۂ اضافیت کو اس طرح بیان کیا'' تمام نظام کے لیے بلا امتیاز حرکت کی حالت کے فطری اصول ایک ہی ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد پر آئنسٹائین نے جدید اصولِ ثقل کی تشکیل کی جس نے گذشتہ تمام قدیم نقطۂ نظر کو جو عرصے سے چلے آرہے تھے اس تحقیق سے ختم ہوگئے آئنسٹائین کی تحقیق کی بنیاد نیوٹن کے اصول اِنرشیا (جمود) پر ہے۔ جس کا نچوڑ یہ ہے کہ کوئی بھی نظام ایک ہی حالت میں قائم رہتا ہے خواہ حالت رُکی ہوئی ہو (ساکن) یا خطِ مستقیم پر حرکت کی حالت میں ہو، تا وقتیکہ کسی

دوسرے ذرائع سے قوت کے ذریعے اس کی حالت میں تبدیلی نہ پیدا کردی جائے۔ اس لیے جب ٹرین مڑتی ہے یا اُس کی رفتار میں اچانک تبدیلی پیدا ہوتی ہے تو جسم جو یکساں حالت میں ہوتا ہے جھٹکا محسوس کرتا ہے۔ یہ احساس انرشیا کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اس طرح اس اصول کی رو سے ایک ریاضیاتی شکل سامنے آتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بغیر شکل کی ہے۔ جس کی وجہ وہ تغیر ہے جو گردش کا نتیجہ ہے۔

سال 2005 آئنسٹائین کے نظریۂ اضافیت کی صدی کا سال ہے اس صدی کو ساری دنیا میں علمِ طبیعیات (فزکس) کے سال کے طور پر منایا جارہا ہے۔ یہاں یہ غیر مناسب نہ ہوگا اگر ہم اس پس منظر میں اُن کے حالاتِ زندگی پر نظر ڈالیں۔

آئنسٹائین 14 رمارچ 1879 کو جرمنی کے ورتیم برگ کے اُلم نامی مقام پر پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے زیورخ سوئزرلینڈ کے پولی ٹیکنک میں فزکس کی تعلیم حاصل کی۔ جب ہم آئینسٹائین کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو اُن کی سائنسی تحقیقی اہمیت کے علاوہ کئی اور پہلو نمایاں ہوتے ہیں، خاص طور پر اضافیت کی تھیوری جو طبیعیات اور ریاضی کی دنیا میں انقلاب لائی، ان کی ابتدائی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ ان کے والد ایک چھوٹے کارخانے کے مالک تھے۔ حالات نے انھیں پریشان رکھا۔ بچپن میں آئینسٹائین سست اور کم گو تھے۔ اس طرح انھوں نے بولنا بھی دیر سے شروع کیا۔ اسکول میں وہ سب سے پیچھے بیٹھتے تھے اور سب سے کم نمبر انھیں ملتے تھے۔ ان کے استاد کا کہنا تھا کہ وہ زندگی میں کچھ نہیں کرسکتے۔ جرمن اسکول کی تعلیم کا طریقہ آئنسٹائین کو بالکل پسند نہیں تھا یہی وجہ تھی کہ انھیں وہاں تعلیم چھوڑنی پڑی اور انھیں سوئزرلینڈ میں تعلیم کے لیے بھیجا گیا۔ روزی کی تلاش میں ان کو سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ آئنسٹائین کو بڑی ناکامیوں کے بعد ایک دفتر میں کلرک کی جگہ ملی جہاں سائنسی تحقیق اور تجربات کا کوئی ماحول نہ تھا۔ چند سال بعد جب ان کے دو سائنسی مضامین شائع ہوئے تو لوگ انھیں بیش قیمت خیال کرنے لگے۔

آئینسٹائین بچپن سے ہی سنجیدہ اور غور وفکر میں ڈوبے رہتے تھے وہ ہر چیز کی صداقت کو پرکھتے تھے۔ ان کا حلقۂ ملاقات محدود تھا لیکن سنجیدہ لوگوں کی محبت و مباحثہ انھیں پسند تھا۔ ان کے مشاغل بھی محدود تھے۔ صبح کا ٹہلنا اور وائلن یا پیانو بجانے کا انھیں شوق تھا۔ موسیقی کا شوق انھیں ماں سے ورثے میں ملا تھا اور ساری زندگی وائلن سے لگاؤ رہا۔ آئنسٹائین کی زندگی شروع سے آخر تک رسومات سے عاری رہی۔ ان کی ضروریات کا دائرہ محدود تھا۔ ہر روز اچھے سوٹ پہننے کے بجائے چمڑے کی ایک جیکٹ ان کے لیے کافی تھی۔ گاؤن کا لباس یا جرابیں وغیرہ ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں، سادہ معمولی غذا پر ان کی گزر ہوتی تھی۔ گھریلو ذمے داریوں سے بھی ان کو دلچسپی نہ تھی اور یہی چیز ان کی پہلی بیوی سے علیحدگی کا سبب بنی۔ ان کی دوسری بیوی کی موت ان کے لیے ایک بڑا حادثہ تھی۔ انھوں نے ایک طویل بیماری میں آئنسٹائین کی خدمت کرکے ان کی جان بچائی تھی۔

1905 میں جب ان کے سائنسی مقالوں کی اشاعت شروع ہوئی تھی انھیں زیورچ یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے مدعو کیا گیا، بعد میں انھوں نے زیورچ اور پراگ یونیورسٹی میں پروفیسر کی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد انھیں ایشیائی سائنس اکادی کارکن پھر ولیم طبیعیاتی انسٹی ٹیوٹ کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ 1920 میں ان کے نظریات تجرباتی طور پر درست ثابت ہوگئے تو وہ اس صدی کے عظیم سائنسداں بن گئے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے آخری بائیس سال امریکہ میں گزارے اور اس دوران وہ پرنسٹن یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر معمور رہے۔ آئنسٹائین نے اپنے پہلے مقالے جس کا موضوع الیکٹرک ایفکٹ تھا کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے پیش کیا تھا جسے مسترد کیا گیا تھا لیکن بعد میں وہ اپنے اس سائنسی نظریے کو شائع کرانے میں کامیاب ہوئے تو آخرکار اسے ماہرین نے تسلیم کرلیا اور اس وقت انھیں متعدد عہدوں کی پیش کش کی جانے لگی اور سولہ سال بعد اس تحقیق پر انھیں 1921 میں نوبل انعام سے نوازا گیا۔

یہ ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ آئنسٹائین ہی تھے جنھوں نے ایٹمی اسلحے کی سخت مخالفت کی اور امریکی صدر کو اس ہولناک ہتھیار کی تیاری کو منسوخ کرنے پر زور دیا تھا۔ اس کے باوجود ہیروشیما اور ناگاساکی کا جو المیہ ایٹم بم گرائے جانے کی شکل میں سامنے آیا جس سے تقریباً سوا لاکھ لوگوں کی جان ضائع ہوئی اور لاکھوں لوگ سسک سسک کر مرتے رہے۔ اس سانحے کے بعد آئینسٹائین امن کے ایک سرگرم مجاہد بن کر رونما ہوئے۔

18 راپریل 1955 کو پرنسٹن (امریکہ) کے ایک اسپتال میں آئنسٹائین کی موت کے بعد دنیا کے اخبارات نے ان کو صدی کا عظیم ترین سائنسداں اور جدید طبیعیات کا بانی بلکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے ایک بلند شخصیت بھی قرار دیا تھا۔ ایک موقعے پر ممتاز امریکی سائنسداں اور آئنسٹائین کے ہم عصر پال ڈیراک نے کیا خوب کہا تھا ''اگر آئنسٹائین نہ ہوتا تو شاید دس بیس برس تک کوئی اور شخص وہ دریافتیں نہ کرتا جن کو اس سائنسداں کی غیر معمولی ذہانت اور تصورات کی بلندی نے پیدا کیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آئنسٹائین نے تنہا ہی سائنسی تاریخ کے دھارے کو بدل دیا۔''

□□□

H-51 Dr. Iqbal Lane, BatlaHouse,
Jamia Nagar,New Delhi-110025

شبیر احمد

# خلائی اسٹیشن کیا ہے؟

چاند ایک سیارہ (Satellite) ہے جو اپنے مدار پر ہماری زمین کا طواف کرتا رہتا ہے۔ شاید چاند کو اس طرح اپنے مدار پر چکر لگاتا دیکھ کر انسان اس بات کی طرف راغب ہوا کہ وہ بھی کوئی ایسا مصنوعی سیارہ بنائے جو چاند کی طرح خلا میں چکر لگاتا رہے اور ہمیں زمین، سورج، چاند، ستارے اور دیگر اجرامِ فلکی کا مشاہدہ و معائنہ کر کے ضروری معلومات فراہم کرتا رہے، انسان اس سمت میں مسلسل کوششیں کرتا رہا اور آخر کار 19 اپریل 1971 کا وہ دن بھی آگیا جب وہ ایک سٹلائٹ بنا کر خلا میں بھیجنے کے لیے تیار ہوگیا۔ سابقہ سوویت روس نے Salyut-1 نام کا ایک مصنوعی سیارہ بنا کر خلا میں بھیجا۔ یہ دنیا کا سب سے پہلا خلائی اسٹیشن (Space Station) تھا اور یکے بعد دیگرے خلا میں خلائی اسٹیشن بنائے جانے لگے۔ آج انسان خلا میں اسپیس اسٹیشن میں رہنے بھی لگا ہے۔ اس خلائی اسٹیشن کا استعمال تجربہ گاہوں کے طور پر کیا جاتا ہے۔ ان تجربہ گاہوں میں جہاں ایک جانب سائنس اور انجینئرنگ سے متعلق تجربے کیے جاتے ہیں تو دوسری جانب ہوائی جہازوں کی مرمت کرنے کا انتظام بھی ہے۔ اس خلائی اسٹیشن کو اب خلائی بندرگاہ (Space ports) بنانے کی کوششیں بھی جاری ہیں تاکہ دور دراز (مثلاً مریخ) سے آنے جانے والے خلائی جہاز (Spacecraft) یہاں ٹھہر سکیں نیز ان کے لیے یہاں ایندھن بھی فراہم کیا جاسکے۔

خلائی اسٹیشن کے لیے یہ ضروری ہے کہ زمین سے خلائی جہازوں کے ذریعے مسلسل رسد پہنچائی جاسکے۔ کچھ رسدات ایسی ہوتی ہیں جو خلائی اسٹیشن کے لیے نہایت ضروری ہوا کرتی ہیں اور جن کے بغیر خلائی اسٹیشن کا وجود ہی باقی نہیں رہ سکتا ہے۔ ان میں مشاہدات و تجربات کے ذریعے جدید معلومات، سیارہ اور راکٹوں کے لیے ایندھن وغیرہ کی فراہمی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ خلائی اسٹیشن کے فرسودہ اور شکستہ پرزوں کی تبدیلی کے لیے نئے پرزے اور آلات نیز جدید تکنیکی جانکاری کی فراہمی بھی نہایت ضروری ہے تاکہ خلائی اسٹیشن کا انتظام بہتر طریقے سے کیا جاسکے اور وہ بلا کسی دشواری کے ٹھیک طرح سے کام کرتا رہے۔ خلائی اسٹیشن میں لائف سپورٹ سسٹم کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ خلائی اسٹیشن میں رہنے والے انسانوں کے زندہ رہنے کے لیے بنیادی ضرورت کی چیزیں فراہم کرتی ہیں۔ ان میں آکسیجن، پانی اور خوراک شامل ہیں۔ علاوہ ازیں یہ سسٹم خلائی اسٹیشن کی اندرونی فضا خوش گوار اور صحت بخش بنائے رکھتا ہے تاکہ خلائی اسٹیشن میں رہنے والے لوگ زندہ اور صحت مند رہیں اور اسٹیشن کے آلات اور پرزے اچھی طرح کام کرسکیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ ایک عام انسان کو زندہ رہنے کے لیے روزانہ تقریباً 630000 سی.یو.سی.ایم. آکسیجن، تقریباً 21 سی.یو.سی.ایم. پانی اور تقریباً پانچ سو گرام خشک غذا کی ضرورت ہوتی ہے نیز انسان جو کاربن ڈائی آکسائڈ گیس اور دیگر فضلات خارج کرتا ہے، اسے بھی ٹھکانے لگانے کا انتظام ضروری ہے اور یہ تمام کام لائف سپورٹ سسٹم کے ذریعے ہی لیے جاتے ہیں۔ عام طور پر یہ لائف سپورٹ سسٹم دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔

اوپن لوپ سسٹم اور کلوز لوپ سسٹم: جس خلائی اسٹیشن میں اوپن۔لوپ لائف سپورٹ سسٹم ہوتا ہے، اس میں غذا، پانی اور آکسیجن مسلسل طور پر زمین ہی سے بھیجے جاتے ہیں نیز وہاں جمع شدہ فاضل اور فاسد مادوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے زمین پر لایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کلوز۔لوپ لائف سپورٹ سسٹم والے خلائی اسٹیشن میں کاربن ڈائی آکسائیڈ اور دیگر فاضل و فاسد مادوں کو ری سائیکل کر کے دوبارہ قابل استعمال بنالیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں سب سے پہلے خلائی اسٹیشن کا نظریہ روس کے سائنسداں Konstantin Tsiolkovsky نے پیش کیا تھا۔ انھوں نے تجربے کے طور پر ایک ایسا بڑا ڈرم نما کمرہ بنایا جو ہمیشہ گھومتا رہتا تھا۔ اس کی اس گردش کی وجہ سے اس میں ایک طرح کی مصنوعی کشش ثقل (Gravity) پیدا ہوتی تھی۔ چوں کہ اس کا مقصد خلا میں اس جگہ معلق رہنا تھا جہاں سے زمین و آسمان کے بارے میں تجربے اور مشاہدے کیے جاسکیں نیز دور دراز سے آنے جانے والے خلائی جہاز وہاں ٹھہریں اور ایندھن بھی حاصل کرسکیں، اس لیے Tsiolkovsky نے اس کا نام اسپیس اسٹیشن رکھا۔

جیسا کہ یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ Salyut-1 دنیا کا پہلا خلائی اسٹیشن تھا جسے اپریل 1971 میں سوویت روس نے خلا میں چھوڑا۔ یہ ایک اوپن۔لوپ لائف سپورٹ سسٹم والا ایک سمپل اسپیس اسٹیشن تھا۔ اسے زمین پر ہی پوری طرح سے تیار کر کے خلا میں بھیجا گیا تھا۔ اس کے بعد روس نے یکے بعد دیگرے سیلیوت کے نو سیریز بھیجے۔ اس سیریز کے تمام اسٹیشن بناوٹ کے لحاظ سے کم و بیش ایک جیسے ہی تھے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ تکنیکی اعتبار سے ان میں ضروری تبدیلیاں ہوتی جاری تھیں۔ ہر نیا خلائی اسٹیشن پہلے کے مقابلے بہتر، زیادہ موثر اور جدید سہولتوں سے مزین تھا۔ بعد کے سیلیوت سیریز میں برقی طاقت اور کمپیوٹر کی سہولتیں پہلے کی بہ نسبت زیادہ کارگر تھیں۔ یہاں تک کہ بعض سیلیوتوں میں کلوز لوپ لائف سپورٹ سسٹم بھی فراہم کیا گیا

تھا۔ سیلیوٹ-6 اور سیلیوٹ-7 میں خلائی جہازوں کے ٹھہرنے کے لیے دو بندرگاہیں (Docking ports) تھیں، جہاں بیک وقت دو جہاز ٹھہر سکتے تھے۔ ایک وہ جہاز جو سائنس دانوں، انجینئروں اور دیگر خلابازوں کو لانے لے جانے کا کام کیا کرتا تھا، جب کہ دوسرا جہاز رسد رسانی کا کام انجام دیا کرتا تھا۔ رسد لانے والے جہاز پائلٹ کے بغیر ہی خود بخود اڑا کرتے تھے۔ بعد کے سیلیوٹوں کو اتنا موثر بنا دیا گیا کہ خلا ہی میں اس کی کارکردگی اور رقبے میں توسیع و اضافہ کیا جاسکتا تھا۔

1973 میں امریکہ نے بھی خلا میں اپنا ایک اسپیس اسٹیشن بھیجا۔ اس کا نام Skylab رکھا گیا تھا۔ اس خلائی اسٹیشن کو زمین ہی پر مکمل طور سے بنایا گیا اور پھر خلا میں چھوڑا گیا تھا۔ اس وقت اس کی کمیت (mass) تقریباً 75 میٹرک ٹن تھی۔ اس لحاظ سے یہ سیلیوٹ-1 کا چار گنا تھا۔ اسکائی لیب کا سسٹم اوپن لوپ۔ لائف سپورٹ والا تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اب تک کے خلائی اسٹیشنوں میں انسانوں کو مستقل طور پر بھیجا نہیں جاسکا تھا لیکن سوویت روس 1986 میں میر (MIR) نامی ایک خلائی اسٹیشن مع انسان خلا میں بھیجنے میں کامیاب ہوگیا۔ دراصل روس کے خلائی اسٹیشن بنانے کا مقصد ہی وہاں انسانوں کو بھیجنا تھا۔ زمین سے میر کو چھ الگ الگ حصوں میں چھوڑا گیا جسے خلا میں جوڑ کر ایک بڑے خلائی اسٹیشن کی شکل دے دی گئی تھی۔ میر میں کئی کلوز۔ لوپ لائف سپورٹ سسٹم تھے اور اس میں بیک وقت تین خلاباز مستقل طور پر رہ سکتے تھے۔ میر میں خلابازوں کو لانے لے جانے کا کام Soyuz نامی ایک اسپیس کرافٹ انجام دیا کرتا تھا۔ جب کہ رسد رسانی کا کام پروگریس نامی ایک خودکار خلائی جہاز سے لیا جاتا تھا۔ پروگریس میں بیک وقت تین میٹرک ٹن رسد لے جانے کی صلاحیت موجود تھی۔ لیکن جب روس کی معیشت بگڑنے لگی اور وہ بدحالی کا شکار ہونے لگا، دریں اثنا ادھر میر کی عمر بھی کافی ہوچلی تھی جس کی وجہ سے اسے زیادہ سے زیادہ رسدوں کی ضرورت پڑنے لگی، ان بحرانی حالات کو دور کرنے کے لیے نویں دہائی میں اپنے اسپیس شٹل کے ذریعے امریکہ نے میر کو رسد پہنچانے کی ذمے داری سنبھالی۔ امریکہ کا یہ اسپیس شٹل روس کے پروگریس کے مقابلے میں کہیں زیادہ رسد رسانی کی صلاحیت رکھتا تھا۔ لہٰذا اب زیادہ سے زیادہ خلابازوں اور بڑے سے بڑے سائنسی تجربوں و مشاہدوں کے لیے میر میں سامان بآسانی پہنچائے جاسکتے تھے۔ لیکن میر اور اسپیس شٹل کا یہ مشترکہ مشن زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہ سکا۔ آخرکار 1998 میں اس مشترکہ مشن کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ امریکہ اب دوسرے پروجیکٹوں پر اپنا دھیان مرکوز کرنا زیادہ ضروری سمجھنے لگا۔ روس اور یوروپ کے خلابازوں نے پروگریس اور سویوز (Soyuz) کے ذریعے مسلسل میر پر آنے جانے اور نقل و حمل کا سلسلہ جاری رکھا۔ مگر مارچ 2001 میں روس نے میر کو بحرالکاہل میں غرق کرکے برباد کردینے ہی میں عافیت سمجھی۔ اس طرح روس کے خلائی مشن کا وقتی طور پر خاتمہ ہوگیا۔

ادھر 1984 میں امریکہ کے نیشنل ایروناٹکس اینڈ اسپیس ایڈمنسٹریشن (National Aeronautics and Space Administration) بھی اپنے ایک اسپیس پروگرام کا اعلان کرچکا تھا۔ اس کے تحت خلا میں دائمی طور پر ایک خلائی اسٹیشن بنایا جاتا تھا۔ اس اسٹیشن کا نام فریڈم (Freedom) رکھا گیا تھا۔ لیکن 1994 میں اس پروگرام کو روس کے میر-2 پروجیکٹ کے ساتھ ملا کر مشترکہ طور پر اس کا نام انٹرنیشنل اسپیس اسٹیشن (آئی ایس ایس) رکھ کر اسے قوت پرواز بخشی گئی۔ روس اور امریکہ کے اس بنیادی اسٹیشن کے علاوہ یوروپین اسپیس ایجنسی سے تعلق رکھنے والے گیارہ ممالک نیز جاپان بھی اپنے اپنے لیباریٹری موڈیول خلا میں بھیج رہے ہیں۔ اس مشن میں کنیڈا ردبوٹ اور اس سے متعلق ضروری سامان و خدمات بھی مہیا کررہا ہے۔

آئی ایس ایس کی تعمیر کا کام 1998 میں شروع کیا گیا۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ایک روسی موڈیول (Module) کو خلا میں چھوڑا گیا۔ دائمی خلابازوں کا ایک گروہ جس میں ایک امریکی اور دو روسی خلاباز شامل تھے، نومبر 2000 میں اس اسٹیشن پر پہنچا اور پھر یکے بعد دیگرے خلاباز اس پُرخطر مشن پر جاتے رہے۔ کچھ کامیاب ہوئے اور کچھ نے اپنی جانیں گنوادیں۔ 2002 کا خلائی حادثہ جس میں ہندستان کی ایک جاں باز خلاباز عورت کلپنا چاولہ نے بھی انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر اپنی جان کی بازی لگادی۔ ایسے حادثوں کے باوجود اس پرخطر مشن کو جاری رکھنا ہوگا۔ اس کے لیے منصوبہ بند طریقے سے کم از کم بیس خلائی جہازوں کو وہاں بھیجنا ہوگا۔ تب ہی امید کی جاسکتی ہے کہ آئی ایس ایس کی تعمیر کا کام 2006 تک مکمل ہو پائے گا۔ جب انٹرنیشنل اسپیس اسٹیشن پایۂ تکمیل کو پہنچے گا تو اس وقت اس کا رقبہ تقریباً 108.5X88.4 میٹر اور اس کی کمیت تقریباً 450 میٹرک ٹن ہوجائے گی۔ اس میں بیک وقت سات لوگ رہ سکیں گے۔ بنیادی طور پر یہ ایک Orbiting Laboratory کا کام انجام دے گا۔ اس میں جدید آلات سے لیس آٹھ مختلف قسموں کی ذیلی تجربہ گاہیں ہوں گی، جو سورج، چاند، سیاروں، ستاروں اور دیگر اجرام فلکی نیز ہماری زمین سے متعلق ایسی معلومات فراہم کریں گی جو انسانیت کے لیے مفید اور کارگر ثابت ہوں گی اور جو انسان کے اشرف المخلوقات کہلانے کی راہ میں مزید دلیلیں بنیں گی۔ اسی امید پر ہی ان خلائی اسٹیشنوں کی کامیابی کا دارومدار ہے۔

□□□

(بہ شکریہ "یوجنا" دہلی، جولائی 2004)

تحریر: رگھوناتھ اننت ماشیلکر
ترجمہ: ممتاز

# نیا زمانہ اور نئی حکمتِ عملی

آج پیداوار اور علم کے استعمال کی کامیابی کی کنجی کا نام ایجاد ہے۔ مستقبل میں کسی ملک کے کام کرنے کی قدرت کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ وہ علم کو ایجادات کے ذریعے کس حد تک دولت اور سماجی اچھائیوں میں تبدیلی کر پاتا ہے۔ یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ ایجادات لوگوں، جماعتوں، تنظیموں اور سماج کے لیے نئی قدریں قائم کرنے کے لیے کی جاتی ہیں۔ یہ نئی قدریں پیداوار اور خدمات میں نیاپن لانے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔

دوسری جنگ عظیم سے پہلے تک ایجادات محض علم کی بازیابی کے لیے کی جاتی تھیں۔ ان دنوں کوئی بھی حکومت ایجادات کے لیے زیادہ رقم خرچ نہیں کرتی تھی۔ سائنسی تحقیق کا کام چند چھوٹے چھوٹے ادارے ہی انجام دیا کرتے تھے۔ صنعتی اور سائنسی تحقیق کی تجربہ گاہوں کی تعداد بہت کم تھی۔ بہت تھوڑی سی صنعتیں ہی سائنسی تحقیق میں معاونت کرتی تھیں۔ تعلیمی اداروں اور صنعتوں کے مابین بہت کم وابستگی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد تحقیق کے میدان میں تبدیلیاں آنی شروع ہوئیں۔ ایک طرف نئے علوم کی جستجو میں تحقیق کے میلان نے زور پکڑا تو دوسری جانب اقتصادی نظام، حفاظتی نظام اور صحت کی حفاظت کے لیے تحقیقات کی رفتار تیز ہوگئی۔ اب حکومت تحقیق کے لیے بڑے پیمانے پر رقم دینے لگی۔ سائنس پر مبنی صنعتیں جیسے بایو ٹکنالوجی، اطلاعاتی ٹکنالوجی کا فروغ ہونے لگا۔ صنعتی سائنس کی تحقیق کے میدان میں بھی ترقی ہوئی اس طرح بڑی بڑی تجربہ گاہوں جیسے امریکہ میں واقع بیل تجربہ گاہ اور بڑے بڑے نوبل انعام یافتہ سائنس داں صنعتی میدان اور تعلیمی میدان کے بیچ اس باہمی تال میل میں اہم کردار ادا کرنے لگے۔

جب روس اور امریکہ کے درمیان چل رہی طویل سرد جنگ ختم ہوگئی تو حفاظتی نظام کو مضبوط و پائیدار بنانے والی خرچیلی تحقیقات کم ہونے لگیں۔ نئے علوم کی جستجو کا اہم مقصد اقتصادی نظام اور حفظان صحت کی ترقی ہوگئی۔

صنعتوں میں بنیادی تحقیق کا کام ہوتا تھا اور اس سے حاصل علوم اور تکنیک سماج کی بہبود کے لیے بھی استعمال میں آتی تھیں۔ اس طرح کا نظام کئی ممالک میں مروج تھا لیکن اس نظام پر اب از سر نو غور و خوض کیا جانے لگا اور تحقیق کے لیے نئے ماڈلوں کی تلاش ہونے لگی۔ جب پودوں، جانوروں اور انسانوں میں جینیٹک انجینیرنگ اور افزائش نسل کی نئی تکنیکوں کے فروغ کی ابتدا ہوئی تو پالیسی سے متعلق نئے سوالات پیدا ہو گئے اور سماجی سائنس دانوں اور ماحولیات کے ماہرین کے تعاون سے نئے اصول وضوابط وضع کیے گئے۔ عالمیت، نجکاری اور شہروں میں تحقیق کو رائج کرنے کے عمل نے بھی تحقیق کو نئی راہ دی۔ پھر عقلی وراثت کے حق اور اطلاعات کی ملکیت جیسے مدعے بھی اہم بنتے چلے گئے۔ ایجادات کی کڑیوں سے جڑے نئے ماڈلوں اور سائنس و سماج کے درمیان سمجھوتوں کے ایک نئے سلسلے کی ابتدا ہوئی۔ جب پوری دنیا میں نئی لہر اٹھی تو ہندوستان کو بھی نئی چنوتیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اب ہندوستان کو مستقبل کے لیے بھی تحقیق کی ضرورت پڑی اور بچے ہوئے اپنے گذشتہ کاموں اور مسئلوں کو سلجھانے کے لیے بھی۔ ایک جانب تو نئی تکنیک اور نئے پیداواری سلسلوں کے فروغ کے لیے تحقیق کا کام شروع ہوا اور دوسری جانب پرانے مسئلوں جیسے خواندگی، سائنس، تعلیم، عوامی بیداری، ذرائع ابلاغ کے میدان میں بھی تحقیق کی شروعات ہوئی۔

مستقبل میں کی جانے والی تحقیقات میں تکنیک سے متعلق تحقیقات کا اہم کردار ہے۔ ہندستان میں تکنیک سے متعلق تین قسم کی تحقیقات شروع ہوئیں۔ پہلے طریقے کی تحقیقات بڑے پیمانے پر کی جانے والی تحقیقات تھیں۔ ان کے تحت انسان کو چاند پر بھیجنے جیسے منصوبے کی ابتدا ہوئی۔ دوسرے طریقے کی تحقیقات روز افزوں ارتقائی مراحل سے گزرنے والی تحقیقات تھیں۔ ان کے تحت مصنوعات جیسے فیکس مشین وغیرہ میں متواتر سدھار کر کے انھیں زیادہ کارآمد بنانے کا عمل شروع ہوا۔ تیسرے طریقے کی تحقیقات اچانک رونما ہونے والی اور کسی مادے میں کوئی بنیادی تبدیلی کے لیے کی جانے والی تحقیقات تھیں۔ ان کے تحت اینٹی بایوٹک صنعتوں میں اچانک یا کسی حادثے کے سبب ہونے والی تحقیقات شامل تھیں۔ یہ ساری تحقیقات رسمی نظام کے تحت شروع ہوئیں اور یونیورسٹیوں میں ایجاد میں مشغول لوگوں کے ذریعے صنعتی تحقیقات اور ترقیاتی تجربہ گاہوں میں بڑے پیمانے پر تحقیق کا کام شروع ہوا۔ دوسری طرف ایجادات میں غیر رسمی نظام بھی متحرک رہا جس کے تحت دستکار، کسان اور زمین سے جڑے دوسرے لوگ نئے نئے کام انجام دیتے رہے، حالانکہ ان کے کاموں کی حوصلہ افزائی نہیں ہو پاتی ہے جبکہ ہندستانی سیاق وسباق میں ہر طرح کی ایجادات کا تجزیہ لازمی ہے۔

ہندستان نے اس طرح کے بڑے تحقیقاتی پروگراموں میں اچھا مظاہرہ

کیا ہے۔ اگر ہم اپنی خلائی تحقیق کا تجزیہ کریں تو ہمیں خاصی تحریک ملے گی۔ سیارچوں کی تعمیر و تشکیل اور ان کی جانچ وغیرہ میں ہمارے سائنس دانوں نے کامیابی حاصل کی۔ ہمارا خلائی پروگرام دنیا کے سب سے زیادہ قیمتی اور موثر پروگراموں میں سے ایک ہے جس کا ایک برس کا بجٹ 50 کروڑ ڈالر رہا جو ایک مشہور امریکی دوا کمپنی کی تحقیق اور ترقیاتی بجٹ کے بہت چھوٹے سے حصے کے برابر تھا۔ یہ کمپنی تحقیق میں کئی سو ڈالر خرچ کرتی ہے۔ لیکن ہمارا خلائی پروگرام نہ صرف کامیابی سے چلتا رہا بلکہ کامیاب بھی تسلیم کیا گیا اور اس نے اچھے نتائج بھی دیے۔ یہ سب ان حالات میں ہوا جب تکنیکی اعتبار سے دنیا کے ترقی یافتہ ممالک ہمیں خلائی تکنیک دینے سے انکار کرتے رہے۔ کئی معاملوں میں اس انکار نے ہماری ایجاداتی مہم کو نئی رفتار عطا کی۔

سوپر کمپیوٹروں کا استعمال متعدد شعبوں میں ہوتا ہے۔ دفاعی شعبے میں استعمال ہونے کی وجہ سے انھیں فن حرب کا ذریعہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ 1980 کی دہائی کی ابتدا میں ہندستان کو موسم کی پیشین گوئی کے لیے سوپر کمپیوٹروں کی ضرورت پڑی تو مغربی ممالک نے اسے دینے سے انکار کر دیا۔ تب بھارت نے متوازی عمل (Parallel Processing) کے ذریعے خود سوپر کمپیوٹر بنانے کا کام شروع کر دیا۔ ہندستانی سائنس دانوں نے 1986 سے 1999 تک اس میدان میں مسلسل کام کیا اور دیسی ایجاد کا ایک غیر معمولی نمونہ پیش کر دیا۔ اس سے ایک دلچسپ سبق ہمیں یہ ملا کہ کسی بھی ایجاد کے لیے ایک تحریکی قوت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کام کا انحصار اس پر نہیں کہ آپ کتنے اہل ہیں یا آپ میں کام کرنے کی کتنی صلاحیت ہے۔ اس واقعہ کا ایک دوسرا دلچسپ پہلو یہ بھی تھا کہ روس نے اپنے سوپر کمپیوٹر بھارت کو فروخت کرنے کی پیشکش کی تھی لیکن جب ہندوستانی وفد ان کی مشینیں دیکھنے روس گیا تو وہ ان کے ہارڈ ویئر سے متاثر نہیں ہوا۔ انجام کار بھارت نے روس سے کمپیوٹر نہیں خریدے۔ اس کے برعکس 90 کی دہائی کے شروع میں روس نے بھارت سے سوپر کمپیوٹر خریدنے شروع کر دیے۔ بعد میں انھوں نے پرم۔10000 بھی خریدے۔ اس سے جڑا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب پابندیاں ہٹائی جاتی ہیں تو بھارت میں آرام کرنے کا میلان فروغ پانے لگتا ہے۔93-1991 میں جب امریکہ نے پابندیوں کی گرفت ڈھیلی کی تو سوال اٹھنے لگا کہ ہندوستان کو اب سوپر کمپیوٹر کے میدان میں مزید سرمایہ کاری کرنی چاہیے یا نہیں۔ اس مسئلے پر دلی میں ایک جنگ سی چھڑ گئی لیکن آخر کار باہمی اتفاق رائے کی جیت ہوئی اور ہم اگلے مشن کی طرف گامزن ہو گئے۔ ورنہ پرم۔10000 ہمارے یہاں تیار نہیں ہو پاتا۔ نئی ایجادات کا سلسلہ بھی انھی کے مطابق تبدیل ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہم ایک دوسری بڑی ایجاد کی مثال دیکھیں جس میں ہندوستان نے بہترین مظاہرہ کیا۔ سبز انقلاب اس کی بہترین مثال ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہم مغربی ممالک سے غلہ امداد یا قرض کی شکل میں مانگتے تھے لیکن اس کے بعد سبز انقلاب ہوا اور اس میں صرف زراعتی سائنس دانوں کے ذریعے کی جانے والی ایجادات ہی شامل نہیں تھیں بلکہ اس کی کامیابی میں ایجادات کی تشہیر کے ماڈل، ایجادات کی اس مہم میں کسانوں کی شمولیت اور دیگر اسباب بھی معاون تھے۔ 1998 میں ہندستان نے 20.4 کروڑ ٹن غلہ پیدا کیا۔ یہ ایک اچھی خبر ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک افسوس ناک خبر یہ بھی ہے کہ غلہ کی پیداوار کے اضافے میں انجماد آ گیا ہے اور اعداد و شمار اس بات کا اشارہ دے رہے ہیں کہ مستقبل میں غلے کی پیداوار میں اضافے کے لیے نئے ایجاداتی ماڈلوں کی ضرورت پڑے گی۔ قیاس ہے کہ 2040 تک ہندوستان کی آبادی 150 کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ اتنی کثیر آبادی کا پیٹ بھرنے کے لیے 35 کروڑ ٹن غلے کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے لیے پیہم سبز انقلاب کو جاری رکھنے کی ضرورت پڑے گی اور اس کے تحت زراعتی کاموں کی پوری مرحلہ وار تیاری، کٹائی اور ذخیرہ اندوزی کے لیے بھی ایجادات کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے ساتھ ہی غلے کی پیداوار میں اضافہ اس طرح کرنا ہوگا کہ ماحول اور زمین کے توازن پر کسی طرح کے منفی اثرات مرتب نہ ہوں۔ ساتھ ہی کم سے کم زراعتی زمین، آبپاشی کے لیے کم سے کم پانی اور کم سے کم معدنیات پر مشتمل توانائی کے ذرائع کا استعمال ہو۔ اس کے لیے تکنیک اور تجربات کو بہتر کارکردگی سے جوڑنا ہوگا۔ اس کے لیے ہمیں جدید بایوٹکنالوجی، خلائی ٹکنالوجی، اطلاعاتی ٹکنالوجی کا بڑے پیمانے پر استعمال کرنا ہوگا۔ دوسری طرح کی ایجادات مسلسل ہونے والی ایجادات کہلاتی ہیں۔ انھیں عام زبان میں نٹ بولٹ ایجادات بھی کہتے ہیں ان کی مدد سے بازار میں لگاتار نئی مصنوعات آتی رہتی ہیں۔ ان کے لیے لگاتار ایجاداتی کوششوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ کمپنیاں اپنی ہی مصنوعات میں مسلسل بہتری لاتی رہتی ہیں کیوں کہ اگر وہ ایسا نہیں کریں گی تو ان کی حریف کمپنیاں بازی مار لیں گی۔

اقتصادی نظام کے سبب ہندوستان میں عملی طور سے ایجادات کے ذریعے تیار کردہ نئی مصنوعات کو بازار میں اتارنے، مصنوعات کی قیمت کم کرنے یا مزید کارآمد بنانے پر بھی کوئی خاص دباؤ نہیں تھا لیکن اب بازار کی رفتار نے حکمت عملی بدل دی ہے۔ اب صرف بہتر مصنوعات ہی بازار میں فروخت ہو پائیں گی اور یہ مصنوعات نہ صرف اپنی خوبیوں اور استعمال کے لحاظ سے بلکہ شکل و صورت، بناوٹ، اجزائے ترکیبی اور اپنی خدمات کی بنیاد پر بھی بہتر ہونی چاہئیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ مسلسل ایجادات ہماری کوششوں کا ایک اٹوٹ حصہ ہوں۔

□□□

H.No. 993, Gali Rajan,
Farash Khana, Delhi - 110006

حکیم اشہر قدیر

# عوارض نفسانیہ

بدلتے حالات اور ماحول کے تناظر میں طرز زندگی بھی تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ آج کا انسان زندگی کو خوشحال بنانے کی جستجو میں مادہ پرستی کی جانب کچھ زیادہ ہی راغب ہے اور آج مادّہ کے حصول کے لیے اس کی زندگی انتہائی پیشہ ورانہ اور عملی ہوگئی ہے۔ جس میں ہر قدم ناپ تول کر اٹھانا پڑتا ہے۔ ذراسی کوتاہی یا لغزش انسان کو کامیابی سے محروم کرسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ہر وقت کسی نہ کسی سوچ وفکر میں ڈوبا رہتا ہے۔ یہ دماغی کرب جب حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو دماغی امراض وتکالیف پیدا ہونے لگتی ہیں جن کو طبی اصطلاح میں ''عوارض نفسانیہ'' کہا جاتا ہے۔ عوارض نفسانیہ اگر زیادہ دیر تک قائم رہیں تو انسان دماغی ہیجان یا تناؤ کا شکار ہوجاتا ہے جو آگے چل کر مایوسی اور ناامیدی میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

اس وقت تناؤ اور مایوسی جیسے عوارض اس قدر عام ہوگئے ہیں کہ ان کو دور کرنے کے لیے لوگ مسکن وتسکینی ادویہ کا استعمال کثرت سے کررہے ہیں۔ بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ایک ایک دن میں دو دو گولیاں لی جاتی ہیں کہ کسی طرح دماغ کو سکون مل جائے لیکن پھر بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

1974 میں عوارض نفسانیہ کی جانب بین الاقوامی عالمی تنظیم صحت (WHO) بھی متوجہ ہوئی۔ اس ادارے کے سبھی ممبران ممالک نے ڈائرکٹر جنرل سے عوارض نفسانیہ کے تدارک کے لیے خاص لائحہ عمل تیار کرنے کی گذارش کی کیونکہ یہ عوارض انسان کو بری طرح متاثر کرتے ہیں جس کے باعث جسم کے تقریباً تمام افعال اثر انداز ہوتے ہیں۔

ماہرین کے مطابق عوارض نفسانیہ انسان کے جسم پر دیرا اثر زہر جیسا اثر ڈالتے ہیں جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ صحت اور مختلف امراض میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ عوارض نفسانیہ سے دماغ کے علاوہ قلب، دوران خون، نظام ہضم و استحالہ سب متاثر ہوتے ہیں۔ آج کل پیدا ہونے والے زیادہ تر امراض جیسے ہائی بلڈ پریشر، ذیابیطس اور بے خوابی عوارض نفسانیہ کی ہی دین ہیں۔

عوارض نفسانیہ اور ان کے نتیجے میں بکثرت پیدا ہونے والے امراض کے سلسلے میں عالمی تنظیمِ صحت کی آنکھ 1974 میں کھلی جب پانی سر سے اوپر ہوگیا اور خودکشی کے معاملات سامنے آنے لگے۔

علم طب میں جہاں صحت ومرض سے بحث کی گئی ہے وہاں واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ بغیر سبب کے نہ تو صحت ممکن ہے اور نہ ہی مرض۔ کچھ اسباب ہیں جو صحت و مرض دونوں کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں۔ ان اسباب کی تعداد چھ قرار دی گئی اور ان کی تعداد اور لزوم کی مناسبت سے ان کو ''اسباب ضروریہ'' سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ اسباب ہیں (1) ہوا محیط (2) ماکولات ومشروبات (3) حرکت وسکون بدنی (4) حرکت وسکون نفسانی (5) نوم و یقظہ اور (6) احتباس واستفراغ۔

مذکورہ اسباب میں حرکت وسکون نفسانی کے تحت عوارض نفسانیہ سے بحث کی گئی ہے۔ جہاں حرکت وسکون نفسانی کا محل دماغ ہے۔ دماغی حرکت جس کو عرف عام میں ''دماغی ہیجان'' کہا گیا ہے ہیجان کن اسباب کا نتیجہ ہے۔ یہ اسباب وہ ہیں جو حواس خمسہ ظاہرہ (پانچ ظاہری قواس) آنکھ، کان، ناک، زبان اور جلد کے ذریعے دماغ تک پہنچتے ہیں جیسے آنکھ سے کوئی خوش منظر دیکھ کر فرحت اور لذت محسوس کرنا۔ اسی طرح کانوں سے کوئی خوش خبری سن کر خوشی سے جھوم اٹھنا یا زبان سے کوئی لذیذ شے کا ذائقہ محسوس کرنا اور لطف اندوز ہونا۔ یہ تمام چیزیں وہ ہیں جو ذہن کو محظوظ کرتی ہیں اور صحت بخش ہیں لیکن اس کے برعکس آنکھ سے کوئی ڈراؤنا وخوفناک منظر دیکھنا کانوں سے کوئی بری خبر سننا یا زبان سے بدذائقہ محسوس کرنا وہ چیزیں جن سے ذہن پریشان اور ہیجانی کیفیت سے دوچار ہوجاتا ہے اور یہ کیفیت صحت کے لیے مضر ہوتی ہے۔ دماغی سکون کو ہر حالت میں بہتر اور صحت کا ضامن بتایا گیا ہے۔ دماغی ہیجان کی صحت میں جو نفسانی عوارض لاحق ہوتے ہیں مندرجہ ذیل ہیں، فرحت ولذت، غم وغصہ، خوف وہراس اور پشیمانی وخجالت۔ یہاں یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ فرحت ولذّت کے علاوہ دیگر جتنے بھی نفسانی عوارض ہیں وہ تمام صحت کے مخالف اور مرض کے معاون ہیں۔

زندگی خوشی اور غم کا مجموعہ ہے۔ انسان کو ہر حال میں خوش اور مطمئن رہنا چاہیے لیکن فطری طور پر یہ بات ممکن نہیں چونکہ حالات کے تحت جب انسان کو مصائب اور غم گھیر لیتے ہیں تو نفسانی عوارض کا پیدا ہونا لازمی ہے۔

اگر کوئی شخص غم وغصہ، خوف وہراس، پشیمانی وندامت سے دوچار ہوتا ہے اور اگر یہ عوارض متواتر ہوں تو ان کے نتیجے میں کئی اور امراض پیدا

ہوجاتے ہیں۔ عہدِ حاضر میں پروفیشنلزم میں اضافہ کی وجہ سے عوارض نفسانیہ میں اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ موجودہ طبی ماہرین نے اس جانب خصوصیت سے توجہ دی ہے۔ بالخصوص Occupational Therapist اس بات پر متفق ہیں کہ جولوگ نوکری پیشہ ہیں انھیں نفسانی عوارض زیادہ لاحق ہوتے ہیں۔ لہٰذا ملازمت پیشہ لوگوں کے حالات اور ان کی دماغی کیفیات کے تجزیے سے کچھ اہم نکات سامنے آئے ہیں۔ اگر یہ معلومات ان لوگوں تک پہنچ جائے جو ملازمت میں ہیں اور مخصوص حالات کے باعث نفسانی عوارض میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ تناؤ اور مایوسی و ناامیدی کا شکار ہوجاتے ہیں، تو وہ ان معلومات کی وجہ سے خود کو ایسے حالات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

ملازمت میں تشفی بہت ضروری ہے اس میں کئی باتیں شامل ہیں جیسے صحیح عمر میں ملازمت کا ملنا، حسبِ لیاقت و ملازمت تنخواہ کا ہونا، دیگر عملہ بالخصوص افسران کا رویہ ٹھیک ہونا، نیز کام کا مناسب مقدار، ٹھیک وقت پر ترقی، مستقل ملازمت، گھر سے ملازمت تک کا سفر، اور تسلی بخش ماحول کا ہونا وغیرہ۔

ظاہر ہے ایک وقت میں یہ تمام باتیں یکجا ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہیں اور ان میں سے ایک چیز کی بھی کمی ملازم کو نفسانی عارضہ میں مبتلا کرسکتی ہے اور یہ عارضہ دیگر بہت سے امراض کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے۔

اگر کوئی ملازم حق تلفی کا شکار ہے تو اس کو غصہ آئے گا اور اگر یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک قائم رہے تو آہستہ آہستہ مایوسی بھی پیدا ہوجائے گی۔ اسی طرح اگر تنخواہ حسبِ لیاقت اور کام کے مطابق نہیں ہے تو صدمہ اور غم کی کیفیت پیدا ہوجائے گی جو بعد میں مایوسی میں بدل جائے گی۔ اسی طرح اگر ملازمت مستقل نہ ہو اور کسی بھی وقت ملازمت سے علیحدہ کرنے کا خوف دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے تو وہ کام کو صحیح طریقے سے انجام تک نہیں پہنچا سکتا اور جب کام میں غلطیاں ہوتی ہیں تو افسران کا رویہ اور برتاؤ بھی اچھا نہیں رہتا ہے۔ یہی کیفیات ہیں جو انسان کو دماغی ہیجان یعنی تناؤ میں مبتلا کردیتی ہیں اور زیادہ عرصے تک تناؤ میں رہنے کے بعد اگلا درجہ مایوسی و ناامیدی کا ہوتا ہے اور یہ ایسی کیفیت ہوتی ہے کہ مریض کسی بھی وقت کوئی بھی جان لیوا قدم اٹھا سکتا ہے اور عام آدمی رفتہ رفتہ ان حالات سے متاثر ہوکر بعض دیگر جانکاہ امراض میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

□□□

Ghaffar Manzil, 157/A, Jamia Nagar, New Delhi-25


## تعلیمی تشکیلِ نو کے مسائل

**مصنف: خواجہ غلام السیدین**

اسکول میں ایک ایسا ماحول بنانا جس میں بچوں کی فطری صلاحیتیں آزاد فضا میں نشو ونما پاکر ابھر سکیں، ان کی فطری نشو ونما کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ اساتذہ کی تربیت ایک خاص نہج پر کی جائے۔ اس کتاب میں انھی امور پر گفتگو کی گئی ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/96 روپے

## خواجہ میر درد

**مصنف: ظہیر احمد صدیقی**

خواجہ میر درد اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کلام میں تصوف کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس کتاب میں درد کے حالاتِ زندگی، ان کی تصانیف، شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نوآموز طلبہ کے لیے ایک بہترین کتاب۔

صفحات: 64، قیمت: 14 روپے

## عربی ادب کی تاریخ (جلد اوّل)

**مصنف: ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی**

اس کتاب کے مقدمے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی نے صاحبِ کتاب کی صلاحیتوں کی داد ان لفظوں میں دی ہے— "ان کے ذہن و ذوق نے اس موضوع کو صحیح طور پر ہضم کرلیا ہے اور وہ اس میں محض نقال یا خوشہ چیں نہیں ہیں بلکہ اس سے لطف لینے میں اہلِ زبان کے شریک اور اہلِ ذوق کے ہم مجلس اور ہمنوا ہیں۔ ان کی تحریر میں سنجیدگی بھی ہے، شگفتگی بھی، سلاست بھی حلاوت بھی، مورخ کا احساسِ ذمہ داری بھی اور ایک صاحبِ ذوق کا انبساط و التذاذ بھی۔"

صفحات: 352، قیمت: -/86 روپے

## قدیم تمل ناڈو میں عربی، فارسی ادبیات کی چار سو سالہ تاریخ ([illegible])

**مصنف: کاوش بدری**

جنوبی ہند میں اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کو بھی خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا۔ اس کتاب میں تمل ناڈو میں عربی زبان و ادب کے فروغ کا تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ نیز وہاں کے اہم علما کا تعارف، کتب خانوں اور نادر مخطوطات کی تفصیلات، اہم عربی مدارس اور عصرِ حاضر میں عربی تعلیم پر بھی گہری نظر ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 176، قیمت: -/98 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: مدن گوپال
ترجمہ: فاخر شہیر عباسی

# شنکر آچاریہ

گذشتہ ابواب میں ہم برہمن واد کے ذریعے پھیلائی گئی رسومات کے خلاف بدھ (560-480ق م) اور مہاویر (540-468ق م) کی بغاوت کے بارے میں لکھ چکے ہیں۔ مہاتما بدھ کی موت کے بعد کے پندرہ سو برسوں کے دوران، بدھ کی عام تعلیمات فلسفیانہ نظریات میں الجھ کر رہ گئیں۔ یہی وجہ ہے جس کی بنا پر چار بودھ کونسلوں کا انعقاد کیا گیا۔ بدعنوانیاں بھی اس میں شامل ہوگئی تھیں۔ آٹھویں صدی تک آتے آتے بودھ خانقاہیں بدچلنی کا مسکن یا ذاتی مفاد پرستی کی علامت بن چکی تھیں۔ نہ صرف بودھ طبقوں میں بلکہ برہمن واد میں بھی مکمل طور سے زوال آ چکا تھا۔ مذہبی صورتِ حال بے حد پیچیدہ تھی۔ روحانی اور اخلاقی ابتری بہت شدید تھی۔

دراصل فلسفیانہ، علمی اور سیاسی میدانوں میں ہندوستانی کامرانیوں کی تابناکی اب ماضی کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ ہندستان کا تخلیقی جوہر زوال پذیر تھا۔ جس طرح بھگوان کرشن کے پندرہ سو برسوں بعد بدھ کا ظہور ہوا تھا، اسی طرح بدھ کی موت کے تقریباً اتنے ہی عرصے کے بعد شنکر آچاریہ کا ظہور ہوا۔ وہ غیر معمولی قابلیت کا حامل تھا، اس نے اپنے فلسفے کے ذریعے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ روزمرہ کی زندگی کا تیاگ اور آزادیِ ذات کی تلاش کا فلسفہ ہر فرد کا مقصد بن چکا تھا۔ اس نے ملک بھر میں ایک کہرام برپا کر دیا۔ بتیس برس کی عمر میں جب اکثر لوگ مستقبل کا خواب دیکھ رہے ہوتے ہیں، اس نے اپنا مشن مکمل کیا اور کیدارناتھ کے مقام پر ہمالیہ میں دنیا کو معنوی طور پر الوداع کہہ دیا۔ اس کے کارنامے آج کے عہد میں ناقابل یقین معلوم ہوتے ہیں۔

788ء میں کیرالہ کے پورنا ندی کے ساحلوں پر آباد گاؤں کے نمبودری خاندان میں پیدا ہونے والا شنکر ایک غیر معمولی صلاحیت کا بچہ تھا۔ حالانکہ وہ تین برس کی عمر میں ہی اپنے والد کے سائے سے محروم ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی اوائل عمری میں ہی کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ ''گروکل'' میں، جہاں اسے پانچ برس کی عمر میں بھیجا گیا تھا اس کے اساتذہ اس کی اعلیٰ ذہانت، تجزیاتی صلاحیت اور غیر معمولی حافظے سے بے حد متاثر تھے۔ تین سال کے بعد اس کا چرچا کوچین کے شاہی دربار تک پہنچا۔ راجا نے اسے ایک اعزازی منصب کی پیش کش کی لیکن شنکر نفس کشی کے جذبے سے سرشار تھا۔ اس نے اس اعزاز کو ٹھکرا دیا اور سنیاس کا راستہ اختیار کر لیا۔ جب وہ صرف گیارہ برس کا تھا، اس کے گرو نے اسے ''آچاریہ'' کا خطاب عطا کیا۔ حالانکہ گرو نے اسے کاشی جانے کا حکم بھی دیا جو اس وقت تحصیل علم کا ایک بے حد اہم مرکز تھا جہاں پورے ہندستان کے تمام مکاتب فکر کے علما موجود تھے۔ شنکر نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس متبرک شہر کی زیارت کی۔ اس نے وہاں پر ہونے والے عظیم مناظروں اور مباحث میں حصہ لیا۔ ہر شخص اس کی علمیت، خطابت اور منطق سے متاثر تھا۔

ان تمام لوگوں نے اس کے فلسفے کی برتری کو تسلیم کیا جسے اس نے قدیم اپنشدوں کی تعلیمات خاص طور سے بھدریان کے ''برہماسترا'' اور ''بھگود گیتا'' میں تلاش کیا تھا۔

شنکر کے منظرِ عام پر آنے سے قبل جنوبی ہندستان میں روحانی سرگرمیاں شدت اختیار کر چکی تھیں۔ الور کے سنتوں کی ویشنوی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ اس نے شنکر کے خیالات کو متاثر کیا۔ شو، وشنو اور دیوی کی عقیدت میں لکھے گئے اس کے سنسکرت گیت آج بھی سنسکرت کے مذہبی ادب میں سب سے مقبول ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ عقیدت اور مذہب کی اعلیٰ قدروں کو تسلیم کرتا تھا۔

قدیم ہندوستانی ادب کی ایک نمایاں شکل جو ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک رشتہ قائم کرتی ہے وہ ہے سوتر کی تفسیر یا اس کی شرح نویسی۔ صرف ایک غیر معمولی ذہانت والا شخص ہی پیدا ہونے والے مسئلے اور تمام موجود آرا کے درمیان تعلق کی تشکیل نو کرنے کا اہل ہو سکتا تھا۔ ایسی تشریحات کرنے کی غیر معمولی صلاحیت سے معمور شنکر آچاریہ نے بارہ تشریحات قلمبند کیں۔ سب سے ممتاز کارنامہ ویدانت سوتر پر اس کی تشریح تھی جو ادویت کی بنیاد ہے۔

حیرت انگیز توانائی اور فعالیت کے بکراں وسائل کے ساتھ اس نے کنیا کماری سے لے کر شمالی ہمالیائی سلسلے تک پورے ہندستان کا پے در پے سفر کیا۔ وہ بدری ناتھ گیا اور وہاں پر ایک اہم مٹھ (خانقاہ) قائم کیا۔ وہ سری نگر (کشمیر) گیا جہاں پر اس نے مندر میں پوجا کی اور ایک ''چکر'' چھوڑا۔ اس

● "Turning Points of Indian History" جناب مدن گوپال کی بے حد اہم کتاب ہے جس میں ہندوستانی تاریخ کے ان پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے جنہوں نے ہندوستانی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ ''اردو دنیا'' میں اس کا ترجمہ ''ہندوستانی تاریخ کے اہم موڑ'' کے نام سے قسط وار شائع کیا جا رہا ہے۔

کے بعد مغربی ساحلوں سے ہوتے ہوئے دوارکا پہنچا اور ایک اور مٹھ کی بنیاد رکھی۔ پھر وہ جگناتھ پوری گیا اور وہاں بھی ایک مٹھ قائم کیا بعد میں وہ میسور کے جنگلی علاقے میں بھی گیا اور اپنے رشیا شرنگ آشرم کی بنیاد رکھی، جسے آج شرنگری مٹھ کے نام سے جانا جاتا ہے جو اس کے ذریعے قائم کیے گئے چار مٹھوں میں سے سب سے اہم ہے۔ شمال، جنوب، مشرق اور مغرب میں قائم کیے گئے یہ مٹھ اپنشدوں کی تعلیم کی نشرواشاعت کے مرکز بن گئے اور پورے ہندوستان سے زائرین ان کی طرف راغب ہونے لگے۔

اپنے سفر کے دوران شنکر نے لوگوں سے ملاقاتیں کیں، ان سے مناظرے اور مباحث کیے اور ان متضاد دھاروں کو ترتیب دینے کی کوشش کی جس نے اس عہد کے ہندوستانی اذہان کو تذبذب میں ڈال رکھا تھا۔

بلاشبہ یہ اس حیرت انگیز شخص کی عظمت ہے کہ اپنی تمام مشغولیات کے باوجود اس نے سنسکرت میں نظمیں لکھنے کا وقت نکالا۔ ان نظموں کا شمار سنسکرت کی عمدہ نظموں میں ہوتا ہے جو بندش الفاظ، امیجری اور طرز فکر کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے انسانی دماغ اور ذہنی عمل کے مظاہرے کے بعض حیرت انگیز اور پراسرار تجزیے پیش کیے ہیں۔

اس میں ایک فلسفی، اسکالر، شاعر، سنت صوفی اور ایک عملی مصلح کی خصوصیات بیک وقت جمع تھیں جس نے اس کی مدد سے ان علما کے مابین ایک فکری اتحاد قائم کیا جن سے اس نے سنسکرت میں گفتگو کی۔ علما کے ذہنوں کو متاثر کرنے کے علاوہ اس نے اکثر اصولوں کو نظر انداز کرتے ہوئے عام سطح پر بھی کام کیا اور فلسفے کے دروازے ان سبھی لوگوں کے لیے کھول دیے جو اس میں داخل ہونے کے اہل تھے۔

بدھ مذہب کے دو اہم فرقے، مادھیمک (Madhyamika) اور یوگی چار (yogicharas) جو شنکر سے قبل موجود تھے وہ دنیا کو سراب تصور کرتے تھے۔ ناگارجن، جس نے مادھیمک راستے کی ایجاد کی تھی، اس نے ''پرگیا'' یا حکمت کے معروف تصور کی وکالت کی جو چیزوں کی ان کے اصل کیفیت کی سمجھ سے اخذ کیا گیا تھا۔ وہ اپنے تشریح کے طریقے اور منطق کے ذریعے اکثر مخالفین کو بھی اپنی بات ماننے پر مجبور کردیتا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ خود شنکر بھی ناگارجن سے بے حد متاثر تھا۔ کسی بھی صورت میں اس نے ناگارجن کے خیالات کو اس حد تک استعمال کیا کہ متعصب ہندوؤں کے ایک فرقے نے شنکر پر ''پرچھن بدھ'' (بدھ کا بہروپ) ہونے کا الزام لگایا اور اس کے باوجود شنکر ہی وہ شخص تھا جس نے بدھ مت کو ہندومت یا برہمن میں ضم کرکے ہندوستان میں بدھ مذہب پر کاری ضرب لگائی۔

حالانکہ وہ مانتا تھا کہ کسی بھی ذات کا کوئی بھی شخص اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکتا ہے مگر وہ برہمنی نظام کی سماجی زندگی کے اکثر پہلوؤں کو بھی تسلیم کرتا تھا جس میں ذات پات کا نظام بھی شامل تھا۔ اصول علم کا پُراسرار آغاز کرتے ہوئے اس نے منطقی طور پر ادویت ازم (وحدانیت) کا ایک مکمل نظام قائم کردیا جس کے تحت انفرادی روح کا کوئی الگ وجود نہیں تھا بلکہ وہ قادر مطلق کا ہی ایک حصہ تھا۔ فلسفے کے ابتدائی کاموں کے برعکس جو دو بنیادی علتوں پرش (توانائی کی مسلسل کام کرنے والی نوعیت) اور پرکرتی (آتما جو کبھی تبدیل نہیں ہوتی) پر مبنی تھے، کی وہ وضاحت کرتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی واحد حقیقت کے دو پہلو ہیں جسے قادر مطلق کہا جاتا ہے اور ان کا کوئی اپنا الگ وجود نہیں ہے۔ ایک بار جب فرد کی اس وحدت کے قادر مطلق کے ساتھ تعلق کو تسلیم کرلیا جاتا ہے تو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی یہ دنیا محض ایک عکس بن جاتی ہے۔ یہ مایا جو موجود اور ناموجود کے درمیان میں ہوتی ہے جس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔

شنکر نے آگے چل کر ہندو اور بدھ مذہب کے درمیان تمام رکاوٹوں کو دور کیا۔ مادھیمک فلسفیانہ تصورات کی گونج شنکر کے ادویت میں سنی جانے لگی۔ بودھ مندر، جیسے کہ جگن ناتھ پوری، ہندو مندر میں تبدیل ہوگئے۔ لوگوں کے زیادہ سے زیادہ ہندو مذہب اختیار کرنے سے بودھ خانقاہوں میں داخلہ تقریباً ختم ہوگیا۔ جیسا کہ ایلیٹ کہتا ہے، ''بدھ مذہب کے ماننے والوں کو عام ہندوؤں سے الگ کرنے والے خط کی اہمیت کم سے کم ہوتی گئی۔''

یہاں تک کہ خانقاہوں میں سکھائے جانے والے مذہبی عقائد بدھ کی تعلیمات سے زیادہ ہندومت سے قریبی مماثلت رکھتے تھے اسی بنا پر ہندوستانی بدھ ازم نے اپنی انفرادیت اور اپنی علاحدہ شناخت کو کھو دیا'' اب ہندوازم اور بدھ ازم میں تفریق کرنا مشکل ہوگیا تھا۔

شنکر کا ایک اور کارنامہ روحانی علوم کے ذرائع، اپنشد، برہما سوتر اور گیتا کے درمیان مکمل امتزاج پیدا کرنا تھا۔ اس کا ان تینوں کا انتخاب صدیوں سے قائم ہے اور یہاں تک کہ مخالف مکتب فکر کے علما نے بھی انھیں تسلیم کیا ہے۔

بدھ اور جین مذاہب میں ان کے اپنے بھکشو ہوا کرتے تھے۔ ہندوؤں میں سنیاسی ہوتے تھے۔ یہ سنیاسی منظم نہیں تھے اور نہ ہی کسی خانقاہی سلسلے سے وابستہ ہوتے تھے۔ شنکر جس نے چار خانقاہی مراکز قائم کیے تھے، سنیاسیوں کو ایک مستقل تنظیم میں شامل کیا۔ ایک بڑی تعداد میں خانقاہی ادارے بھی وجود میں آئے جو مذہبی احکامات فراہم کرتے تھے۔ ان خانقاہی اداروں نے ہندوازم کو دوبارہ منظم کرنے میں اہم رول ادا کیا اور ہندوازم کو فلسفیانہ عقائد کا ایک مجموعہ فراہم کیا جس نے اسے اسلام اور بعد میں عیسائیت کے حملوں کا سامنا کرنے کے قابل بنایا۔

□□□

مکتی ورما

# مظہر امام سے گفتگو

**● مظہر امام کا شمار موجودہ عہد کے ممتاز شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کی پیدائش 5/مارچ 1930کو دربھنگہ میں ہوئی۔ گریجویشن تک تعلیم دربھنگہ میں ہی حاصل کی۔ اردو میں ایم.اے. مگدھ یونیورسٹی سے اور فارسی میں ایم.اے. بہار یونیورسٹی سے کیا اور دونوں امتحانوں میں یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ کلکتہ میں سی.ایم.او. ہائی اسکول میں سات سال تک درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہے بعد ازاں آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔ تیرہ سال دوردرشن سے وابستہ رہے اور سرینگر دوردرشن سے بحیثیت ڈائرکٹر 1988 میں سبک دوش ہوئے۔**

**مظہرامام صاحب کے پانچ شعری مجموعے زخمِ تمنا (1962)، رشتہ گونگے سفر کا (1974)، پچھلے موسم کا پھول (1988) بند ہوتا ہوا بازار (1993)، پالکی کہکشاں کی(2000)۔ تنقیدی و تحقیقی مضامین کے چار مجموعے، آتی جاتی لہریں (1981)، ایک لہرآتی ہوئی (1997) تنقید نما (2004)، آزاد غزل کا منظرنامہ (1988) اور خاکوں کا مجموعہ "اکثر یاد آتے ہیں" (1993) شائع ہوچکے ہیں۔ امریکن پروگرام انسٹی ٹیوٹ آف امریکہ نے مظہر امام کوان مجموعی خدمات (لائف ٹائم اچیومینٹ) کے اعتراف میں 1998میں "مین آف دی ایئر" اعزاز دیا۔ اس کے علاوہ انہیں دلّی اُردواکادمی ایوارڈ،بہارکامظہرالحق ایوارڈ،غالب ایوارڈ،متھلااکادمی ایوارڈاور ساہتیہ اکادمی انعام مل چکا ہے۔**

سوال:آپ کا رجحان شاعری کی طرف کیسے ہوا اور آپ نے شاعری کب شروع کی؟

جواب: میرے گھر میں شعروادب کا ماحول بالکل نہیں تھا۔ ہاں میرے ننیہال میں میرے ماموں منظوراحمد نظر شاعری کا زبردست شوق رکھتے تھے۔ ان کی صحبت کا اثر مجھے یا پھر شوق۔ میرے بڑے بھائی افسانے بھی لکھنے لگے تھے اورشاعری بھی کرنے لگے تھے جبکہ مجھے شاعری سے بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ میں اپنی ماں سے شکایت کیا کرتا تھا کہ بڑے بھائی کو پڑھائی کا کم اور شاعری کا زیادہ شوق ہے۔ لیکن انھی دنوں ایک مشاعرہ ہوا جس نے میری کایا پلٹ کر دی۔ مشاعرے سے واپسی کے بعد میں نے شاعری شروع کردی ۔ اس وقت میری عمر تیرہ(13 )برس تھی اور میں میٹرک کا طالب علم تھا۔

سوال:آپ کے کیریئر میں بھی کافی تبدیلیاں آئیں۔ اگر میں غلط نہیں ہوں تو آپ کے کیرئیر کاآغازتدریس کے پیشے سے ہوا اور پھر سترہ برس ریڈیو اور اس کے بعد سری نگر دوردرشن میں ڈائریکٹر کے عہدے پر رہے اور وھیں سے سبک دوش ھوئے۔ یہ دونوں مختلف پیشے آپ کو کیسے لگے؟

جواب: جہاں تک دونوں پیشوں کے مختلف محسوس ہونے کا سوال ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ مجھ میں ہر طرح کے ماحول کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو میں یونیورسٹی کا استاد بننا چاہتا تھا ، میری یہ خواہش کسی حد تک پوری بھی ہوئی۔ گریجویشن کے بعد کلکتہ کے ایک روزانہ اخبار" کارواں" سے بلاوا آیا اور میں اس میں کام کرنے لگا۔ لیکن 21دن کے بعد وہ بند ہوگیا۔دو مہینے میں نے فاقہ مستی میں گزارے اور اس کے بعد سات سال ایک اسکول میں

پڑھایا، آل انڈیا ریڈیو میں 17 برس پروگرام ایگزیکٹیو اور دوردرشن میں تیرہ برس گزارے۔ جیسا کہ آپ جانتی ہیں کہ تدریس کے پیشے میں سنجیدگی تھی اور ریڈیو اور ٹی وی میں گلیمر تھا۔ لہٰذا ان کی طرف میلان ہونا ایک فطری چیز تھی۔ ریڈیو میں آنے کے بعد میں نے کہا تھا کہ میں نے اپنی کشتیاں جلادی ہیں:

میں عکس عکس رنگِ بہاراں میں کھو گیا
یہ حادثہ عجیب ہے ہونا تھا، ہوگیا

ٹی وی اور ریڈیو کا ماحول میرے مزاج کے مطابق تھا، یہاں میری شاعری کو بڑے بڑے رقیبوں کی صحبت سے تحریک ملی اور میں نے کشمیری غزلوں کے نام سے بہت سی غزلیں کہیں جو بہت مشہور ہوئیں۔ میری غزلوں کے مجموعے ''پچھلے موسم کے پھول'' پر ساہتیہ اکادمی کی طرف سے انعام بھی ملا۔

**سوال: "پچھلے موسم کا پھول" جس پر آپ کو ساھتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے کچھ پسندیدہ اشعار سنائیے۔**

جواب:

دل اکیلا ہے بہت لالۂ صحرا کی طرح
تم نے بھی چھوڑ دیا ہے مجھے دنیا کی طرح

---

مجھ سے یوں بچھڑو نہ تم عہدِ گذشتہ کی طرح
دل کے نزدیک رہو وعدۂ فردا کی طرح

---

تم ہوا ہو تو بکھیرو مجھے ساحل ساحل
موج ہے ہو تو بہالو مجھے دریا کی طرح

**سوال: آپ نے آزاد غزل کا نیاتجربہ کیا۔اس "صنفِ سخن" میں جوآپ کی پہلی غزل تھی جسے آزاد غزل کی بنیاد کہنا بہتر ہوگا۔ اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟**

جواب: آزاد غزل کا تجربہ میں نے سترہ برس کی عمر میں کیا۔ اکثر غزل پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں غیر ضروری الفاظ لائے جاتے ہیں اور کبھی دو مصرعوں میں خیال پوری طرح ادا نہیں ہو پاتا ہے اور بہت سی باتیں مبہم رہ جاتی ہیں۔ اس زمانے میں میں نے آزاد نظموں کا مطالعہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ مصرعے تو چھوٹے بڑے ضرور ہیں لیکن ہم قافیہ ہیں اور مجھے یک لخت لگا کہ ایسے تو آزاد غزل بھی کہی جاسکتی ہے یعنی شعر کے دونوں مصرعے چھوٹے بڑے ہوں لیکن قافیہ اور ردیف کی پابندی رہے جو غزل میں ہوتی ہے۔ پہلی بار 1962 میں میرے مجموعۂ کلام ''زخمِ تمنا'' میں یہ غزل شائع ہوئی۔ اس کے بعد میری دوسری آزاد غزل 1968 میں ''شب خون'' رسالے میں چھپی اور اس کا کافی چرچا ہوا۔ لاہور سے شائع ہونے والے رسالے ''فنون'' میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے مضمون میں اس کا بطور خاص حوالہ دیا اور وہاں کے مشہور شاعر ظفر اقبال نے بھی آزاد غزل کہی۔ اس طرح آزاد غزل کا سلسلہ چل نکلا۔ آج تک تین سو سے زیادہ شاعروں نے آزاد غزل کہی ہے جن میں قتیل شفائی، رفعت سروش، ساحر ہوشیار پوری، کرشن موہن وغیرہ شامل ہیں اور آج خوشونت سنگھ کے لفظوں میں:

"Waves of modernity swept over the traditional form of Ghazal in both the countries, India and Pakistan. So we have scores of poets in both the countries indulging in Azad (unfettered) Ghazal. Qateel Shifai is its best exponent from Pakistan.

Mazhar Imam who is the pioneer of this form of poetry is the best known modernist. A couplet from his Azad Ghazal:"

یوں بھی جی لیتے ہیں جینے والے
کوئی تصویر سہی آپ کا پیکر نہ سہی

**سوال: آپ تنقید کی طرف کیسے راغب ہوئے؟**

جواب: میں بنیادی طور پر ادب کا قاری ہوں۔ میری دلچسپی ادب کی تخلیق سے زیادہ ادب کے مطالعے میں رہی ہے۔ میں نے اردو کے علاوہ انگریزی، فارسی اور انگریزی کے حوالے سے دوسری زبانوں کے ادب کو پڑھنے کی کوشش کی۔ دوران مطالعہ جو خیالات ذہن میں آتے رہے ان کو نوٹ کرتا رہا۔ میں نے مخمور جالندھری کے مجموعے پر تبصرہ 1948 میں لکھا تھا۔ اس کے بعد کچھ مضامین میں نے ایسے لکھے جو رسمی تنقید سے ذرا ہٹ کر تھے اس لیے پسند بھی کیے گئے اور پھر بہت سے مضامین مذاکروں کے لیے لکھے۔ ''اکثر یاد آتے ہیں'' کے نام سے میں نے ادبی شخصیتوں کے خاکے شوقیہ طور پر لکھے جو کتابی صورت میں چھپے اور مقبول بھی ہوئے۔

**سوال: ترقی پسند تحریک سے بھی آپ کا تعلق رہا ہے۔ آپ کن ترقی پسند شاعروں یا ادیبوں سے متاثر ہوئے؟**

جواب: ترقی پسند ادبی تحریک سے میرا تعلق سولہ سترہ برس کی عمر سے ہی قائم ہوگیا تھا۔ اس وقت تک نئے ادب اور ترقی پسندی میں کوئی خاص فرق نہیں سمجھا جاتا تھا اس لیے ترقی پسند لکھنے والوں کے ساتھ محمد حسن عسکری، ن م راشد، میراجی وغیرہ بھی میرے پسندیدہ لکھنے والے تھے۔ اس زمانے میں

آسانی سے دستیاب ہوجاتے تھے۔ انگریزی کے شاعروں میں ایلیٹ، برنارڈ شاہ لوئی میکنیس سے میں خاصا متاثر رہا۔

سوال: آپ کی شاعری شیریں لب و لہجے، سادگی اور سنجیدگی سے عبارت ہے۔ یہ خصوصیات آپ کی شاعری میں کیسے آئیں؟

جواب: دراصل میرے مزاج میں بچپن سے ہی حسن پرستی اور نرمی کا دخل رہا ہے۔ میں ہر چیز میں حسن اور دلکشی تلاش کرتا ہوں۔ میں زندگی کے لیے نظم وضبط کو اہمیت دیتا ہوں اور یہی سلیقہ میری شاعری میں شروع سے ہی کارفرما رہا ہے۔ شاعری خیالات سے زیادہ الفاظ سے بنتی ہے اور میں نے الفاظ کے انتخاب میں حسن، دلکشی، نرمی اور شیرینی کا خاص خیال رکھا ہے۔ اصل میں شعر کہتے ہوئے یہ سب اپنے آپ آجاتا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگوں کو میری شاعری کا یہ پہلو بہت پسند آتا ہے۔

سوال: آپ کی شاعری کا ترجمہ کن زبانوں میں ہوا ہے؟

جواب: میری شاعری کے ترجمے انگریزی، روسی، عربی، فارسی کے علاوہ ہندوستان کی تمام مشہور زبانوں یعنی بنگالی، مراٹھی، تمل، تیلگو، پنجابی میں ہوئے ہیں؟

سوال: شاعری اور عشق کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ کیا شاعری کے ساتھ آپ کی حقیقی زندگی میں بھی ایسا محسوس کیا جاسکتا ہے؟ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے:

میں تیرا ہی ہوکے رہ گیا ہوں
ورنہ یہ جہاں بھی کیا بُرا ہے

---

دل اکیلا ہے بہت لالۂ صحرا کی طرح
تم نے بھی چھوڑ دیا ہے مجھے دنیا کی طرح

جواب: یہ رشتہ بڑا ہی فطری ہے۔ لیکن اس کا اثر حقیقی زندگی پر پڑنا ضروری نہیں۔ ہاں میری شاعری ایسی ضرور ہے جیسے کہ دل اکیلا ہے... وغیرہ۔ یہی احساس شاعر کو عام آدمی سے الگ کردیتا ہے۔ عام آدمی ہزاروں مرتبہ یہ سب سوچتا ہے مگر کہہ نہیں پاتا۔ شاعر کہہ کر دل ہلکا کرلیتا ہے۔ اصل میں خوب صورت رشتوں کی اہمیت کا احساس اور لفظوں میں پروکر انھیں دلکش بنانا ہی شاعری ہے۔

سوال: ادب اپنے زمانے کے تابع ہوتا ہے اور اس کے مطابق ادب میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ کیا آپ کی شاعری میں یہ تبدیلیاں واقع ہوئیں؟

جواب: میری شاعری ہمیشہ زمانے کے بدلتے ہوئے رجحانات کا ساتھ دیتی رہی ہے۔ میری شاعری کا ابتدائی دور کلاسیکیت سے متاثر رہا۔ اس کے بعد اس پر ترقی پسند تحریک کا اثر رہا۔ پھر جدیدیت کا رجحان ہوا اس کے بعد کھلے ذہن سے سوچنے کا رجحان بھی ہوا جو ان دونوں سے الگ ہے۔ میں نے خود بھی اسے پسند کیا اور میری شاعری پر اس کا اثر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

سوال: آپ کی شاعری پر عالمیت کا کتنا اثر ہے؟

جواب: میری شاعری پوری انسانیت سے وابستہ ہے۔ اپنی قوم اور اپنے وطن کی تمناؤں اور آرزوؤں کا اظہار جو میری شاعری میں ہوا ہے، وہ بھی کسی محدودیت کو ظاہر نہیں کرتا۔ پوری دنیا آج جن مسائل سے دوچار ہے، ان پر میری نظر ہے اور میں ان پر غور وخوض بھی کرتا رہتا ہوں۔ میری نظم ہو یا غزل، وہ آج کے تقاضوں سے الگ نہیں ہے۔ بین الاقوامیت یا عالمیت کے مطالبات سے آج کا حساس شاعر آنکھیں نہیں چُرا سکتا۔ دنیا سمٹ کر بہت چھوٹی ہوگئی ہے۔ میری شاعری عالمی نظریات سے ہم آہنگ ہے۔

سوال: موجودہ دور میں جب یہ کہا جانے لگا تھا کہ اردو کا دائرہ سمٹ رہا ہے ایسے میں قومی اردو کونسل نے ایک وسیع لائحۂ عمل کے ساتھ اس زبان کے تحفظ اور بقا کی کوششیں کی ہیں۔ ان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اہم باڈی ہے۔ اس نے اردو زبان وادب کے فروغ میں کئی اہم کام کیے ہیں۔ کمپیوٹر کے ذریعے اس نے اُردو کو نئے زمانے کا ہم قدم بنایا ہے۔ جگہ جگہ اردو کتاب میلے کے ذریعے اس نے اردو کتابوں کو قارئین کے ایک وسیع حلقے تک پہنچایا ہے اور اردو جاننے والوں کو اپنی زبان کی کتابیں خرید کر پڑھنے کی طرف راغب کیا ہے۔ قومی کونسل نے اردو کتابوں کی اشاعت کا ایک اعلیٰ معیار بھی قائم کیا ہے۔ نہ صرف ادبی، بلکہ سائنسی، معاشی، سماجی اور دوسرے موضوعات پر بھی اس نے کارآمد کتابیں شائع کی ہیں۔ اُمید ہے قومی اردو کونسل اپنے دائرۂ کار کو مزید بڑھائے گی، اور اُردو والوں کی تمام توقعات کو پورا کرے گی:

یہ انتہا نہیں، آغاز کارمرداں ہے

سوال: "اردو دنیا" کے قارئین کے نام آپ کیا پیغام دیں گے؟

جواب: اردو زبان کے تحفظ اور بقا کی کوشش میں عملی تعاون دیجیے اور اپنے بچوں کو اردو ضرور پڑھایئے۔ اگر آپ کے بچے اردو سے نا آشنا رہ گئے تو وہ اپنی تہذیبی اور ثقافتی جڑوں سے کٹ جائیں گے۔

□□□

24D/PKT III, Phase I, May Delhi-91

مخمور سعیدی

# ذکر ایک ہمدمِ دیرینہ کا

راہی شہابی سے میرا تعارف اور تعلق لگ بھگ پچاس سال پرانا تھا۔ ابھی میں ٹونک کی سکونت ترک کر کے دہلی نہیں آیا تھا اور ان دنوں استادِ مرحوم بسمل سعیدی بھی ٹونک ہی میں مقیم تھے۔ میں ہفتے میں ایک دو بار ان کی خدمت میں حاضری دینے ان کے مکان پر جاتا۔ ایک بار دورانِ گفتگو میں انھوں نے راہی صاحب کا ذکر کیا، جو ان دنوں اپنے نام کے ساتھ شہابی نہیں، بلندشہری لکھا کرتے تھے، اور بتایا کہ یہ ان کے دیرینہ دوست کنور یٰسین علی خاں شہاب برنی کے فرزند اکبر ہیں۔ کنور صاحب موصوف اپنی نوجوانی کے دنوں میں آغا حشر کاشمیری کے ساتھ کام کر چکے تھے اور ڈرامے سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ بسمل صاحب نے راہی صاحب کی کچھ نظمیں بھی دکھائیں جو انھوں نے اصلاح کے لیے بھجوائی تھیں۔ نظمیں رومانی نوعیت کی تھیں اور ان پر اختر شیرانی کے اثرات صاف نظر آتے تھے۔

راہی سے ملاقات میرے دہلی آجانے کے بعد ہوئی اور پھر یہ ہمیشہ کی دوستی میں بدل گئی۔

ان دنوں راہی، اپنے والد بزرگوار اور دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ علی گڑھ میں مقیم تھے۔ جب میں پہلی بار علی گڑھ گیا تو ان کے پاس ہی ٹھہرا۔ وہ ایک پرانی وضع کی کوٹھی میں رہتے تھے جو شاید پہاسو ہاؤس کہلاتی تھی اور جس کے بوسیدہ در و دیوار اپنی گم شدہ شان و شوکت کی داستان خاموشی کی زبان سے سنا رہے تھے۔ وہیں میں نے کنور یٰسین علی خاں صاحب شہاب برنی کو بھی پہلی بار دیکھا اور ان کی بزرگانہ شفقتوں سے بہرہ یاب ہوا۔ راہی کے دونوں چھوٹے بھائی فصاحت علی خاں اور شجاعت علی خاں اس طرح پیش آئے جیسے وہ میرے بھی چھوٹے بھائی ہوں۔ یہ اس تہذیبی رکھ رکھاؤ کا اظہار تھا جو اپنے بزرگوں سے انھیں وراثتاً ملا تھا۔

راہی نے ایک بڑے زمیں دار گھرانے میں جنم لیا۔ ظاہر ہے ان کا بچپن ناز و نعم میں گزرا ہوگا لیکن جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو ملک کی تقسیم کا واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ اس واقعے کے جو عواقب سامنے آئے وہ گوناگوں تھے، مثبت بھی اور منفی بھی۔ مثبت پہلو یہ تھا کہ ملک غیر ملکی تسلط سے آزاد ہوگیا تھا لیکن تقسیم کے نتیجے میں یہ آزادی اپنے جلو میں قتل و غارت کے ہنگامے بھی لائی اور معاشرتی اور معاشی اتھل پتھل بھی۔ ایک جمی جمائی بساط الٹ گئی تھی اور جو بساط اب جمنے والی تھی، اس پر کسے کس مہرے کا کردار ادا کرنا ہوگا، اس کا فیصلہ ابھی ہونا تھا۔ یہ فیصلہ ہوا تو مہرے یکسر بدل گئے۔ ملک میں جمہوری نظام نافذ ہوا جس میں خواص کی جگہ عوام لے رہے تھے۔ یہ ایک مبارک عمل ہی کہا جائے گا لیکن اس عمل میں خواص پر جو گزری، اس کے انسانی پہلو خاصے اندوہناک تھے۔ راہی کی شاعری میں اس اندوہ کا اظہار مختلف پیرایوں میں ہوا ہے۔

اسی زمانے میں راہی پر ٹی۔ بی۔ کے موذی مرض نے حملہ کر دیا اور انھیں ایک سینی ٹوریم میں داخل ہونا پڑا۔ وہ معالجے کے طویل عمل سے گزرے اور خدا کے فضل سے شفایاب ہوئے۔ اس وقت تک ان کے خاندان کے معاشی حالات بگڑنے لگے تھے چنانچہ اسپتال سے باہر آتے ہی انھیں فکر معاش نے آگھیرا جس سے وہ پہلے کبھی دوچار نہیں ہوئے تھے۔

اسے میں راہی کے کردار کی استقامت کہوں گا کہ وہ بدلے ہوئے حالات سے گھبرائے نہیں اور انھوں نے پامردی سے ناسازگار ماحول کا سامنا کیا۔ وہ علی گڑھ کو خیرباد کہہ کر دہلی آگئے، یہاں انھوں نے مختلف اردو اخبارات کے لیے کام کیا اور جن حالات میں کام کیا، ان سے نباہ کر لینا آسان نہ تھا۔ مسلم ملکیت کے اردو اخبارات و رسائل میں کام کرنے والوں کے لیے صورتِ حال آج بھی آزمائش میں ڈال دینے والی ہے لیکن آج سے پچیس تیس سال پہلے تو یہ اور بھی حوصلہ شکن تھی۔ راہی نے جس اخبار کے لیے زیادہ مدت تک کام کیا اس کے مدیرِ محترم تو جو اخبار کے مالک بھی تھے، اپنے کارکنوں سے برائے نام اجرت پر کام لینے اور وہ بھی وقت پر ادا نہ کرنے کے لیے خصوصی شہرت رکھتے تھے۔ غنیمت یہ تھا کہ راہی کو رہنے کے لیے ایک ایسا ٹھکانہ مل گیا تھا جس کا انھیں کرایہ نہیں دینا پڑتا تھا۔ مولانا انور صابری مرحوم نے انھیں اپنے دو منزلہ مکان کے نچلے حصے میں ایک چھوٹا کمرہ رہنے کو دے دیا تھا۔ یہ مکان دہلی کی تاریخی جامع مسجد کے قریب محلہ چوڑی والان کی گلی سرخ پوشاں میں واقع تھا اور مولانا کو بخشی غلام محمد نے دلوایا تھا۔ ان دنوں میں بھی اسی محلے کی گلی تخت والی میں ایک بڑے مکان کی برساتی میں رہتا تھا۔ یہ برساتی جس پر ٹین کی چھت تھی اور تین طرف کی دیواریں لکڑی کی تھیں، گرمی کے موسم میں دن کے وقت تنور کی طرح تپنے لگتی اور جاڑے کی راتوں میں کرۂ زمہریر بن جاتی۔ چھٹی کے دنوں میں اکثر میں راہی کی طرف چلا جاتا یا وہ

میری طرف چلے آتے۔ ہمارے درمیان ایک قدر مشترک دونوں کے حالات کی سختیاں بھی تھیں۔

راہی نے دہلی میں شاید ڈیڑھ دو سال کی مدت گزاری پھر وہ جے پور چلے گئے جہاں کنور تیسین علی خاں صاحب اپنے دونوں چھوٹے بیٹوں کے ساتھ پہلے ہی منتقل ہو گئے تھے۔ انھوں نے غالباً اپنی علی گڑھ کی کوٹھی فروخت کر دی تھی۔ کنور صاحب کو جے پور بلانے والے ان کے رشتے کے بھائی نواب مکرم علی خاں صاحب تھے جو جے پور کے بڑے رئیسوں میں تھے۔

جے پور پہنچنے کے بعد راہی کے حالات و معاملات میں بہتری آنی شروع ہوئی' وہ سرکاری ملازمت میں آ گئے اور ان کی شادی بھی ہو گئی۔ شادی بیگم مکرم علی خاں کی بھتیجی سے ہوئی جو ایک سلیقہ شعار خاتون ہیں جنھوں نے راہی کو نہ صرف گھر کے انتظامی امور کی الجھنوں سے دور رکھا بلکہ بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمے داری بھی نبھائی۔ لیکن جے پور کے زمانۂ قیام میں راہی کو کچھ بڑے صدموں سے بھی دو چار ہونا پڑا: والد کے سائے سے محرومی، پھر چھوٹے بھائی شجاعت کی دائمی مفارقت اور ابھی کچھ مدت پہلے جواں سال بیٹے کی حادثاتی موت۔ ان حادثوں نے راہی کی شاعری پر جو اثر ڈالا وہ زندگی کی بے یقینی اور انسانی وجود کی بے اساسی کے شدید احساس کی صورت میں نمایاں ہوا ہے۔ یہ احساس ان کی پوری شاعری' حتیٰ کہ ان نظموں میں بھی جو عزم و عمل کا پیغام دینے والی ہیں، جاری و ساری ہے اور ان کے ہاں ایک بنیادی احساس کی حیثیت رکھتا ہے۔

راہی برسوں سے مشاعروں کے مقبول ترین شاعروں میں تھے۔ کسی مشاعرے میں ان کی شرکت اس مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت ہوا کرتی، مشاعروں میں وہ خطیبانہ آہنگ کی نظمیں پر جوش انداز میں سناتے، ان میں سے کچھ نظمیں ہنگامی نوعیت کی ہوتیں، جن کا اثر جلد ہی زائل ہو سکتا ہے اور شاید ہو بھی جاتا تھا۔ ان کی اصل کامیابی یہ تھی کہ وہ ''واپسی'' یا ''ایک لمحہ'' جیسی اپنی نظموں سے بھی جو جذباتی ٹھہراؤ اور فکری سنجیدگی سے مملو نظمیں ہیں، سامعین کے دلوں کی دھڑکنیں تیز کر دیتے تھے بلکہ سننے والے زیادہ توجہ اور انہماک سے سننے پر خود کو مجبور پاتے۔ راہی کا پڑھنے کا انداز کسی طوفانی ندی کی طرح تھا، وہ الفاظ کی روانی، خیالات کے بہاؤ اور اپنی آواز کے ریلے میں سامعین کو اپنے ساتھ خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتے تھے۔ اپنی بیماری سے پہلے تک کیفی اعظمی بھی اپنے پڑھنے کے انداز سے مشاعرے پر چھا جاتے تھے مگر ان کی آواز میں طوفانی ندی کے زور سے زیادہ بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی کڑک تھی جو سامعین کو مبہوت کر دیتی تھی۔ راہی کے ہاں گرج اور کڑک کم تھی مگر وہ پڑھتے بڑے زور شور سے تھے۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے کہ راہی کی ابتدائی شاعری پر اختر شیرانی کے اثرات صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔ 1950 سے 1960 تک کے درمیانی عرصے میں وہ اختر شیرانی کے غیر مشروط معتقد نظر آتے ہیں، موضوعات میں بھی اور موضوعات کی پیشکش کے انداز میں بھی۔ اختر شیرانی سے اثر پذیری کے سبب ہی انھوں نے ابتدا ہی سے غزل سے زیادہ نظم سے دلچسپی لی جو آخر تک برقرار رہی لیکن آگے چل کر جب انھیں زندگی کے سفاک رویّوں کا تجربہ ہوا تو وہ ان رومانی دھندلکوں سے باہر نکل آئے جو اختر شیرانی کی یاد دلاتے ہیں۔ گرد و پیش پھیلے ہوئے حقائق کی تیز دھوپ نے ان کے فکر و احساس پر چھائے ہوئے ان دھندلکوں کو صاف کر دیا اور وہ زندگی کی بے رحم سچائیوں سے آنکھیں چار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس مرحلے پر کچھ دور تک وہ جوش ملیح آبادی کے ہمقدم رہے مگر پھر انھوں نے ان سے بھی بچ کر چلنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں اپنی راہ الگ نکال لینے میں کامیاب ہوئے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے دو بڑے شاعروں سے متاثر ہوئے لیکن پھر اس تاثر کو انھوں نے اپنی مزاجی کیفیات سے اس طرح آمیز کیا کہ ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا ہوا جو ان کی پہچان بن گیا۔ اس آہنگ میں اختر شیرانی کے لہجے کا ترنم بھی ہے، جوش کے لہجے کی تیزی و تندی بھی مگر دونوں کے امتزاج سے ایک نیا طرز بیان پیدا ہو گیا ہے جس کے ترنم میں ایک دھیما پن ہے اور تیزی و تندی میں ایک ٹھہراؤ کی کیفیت۔

راہی شہابی اصطلاحی معنوں میں نہ ترقی پسند شاعر تھے نہ جدیدیت کے ہمنوا نہ مابعد جدید میلانات کے حامل لیکن ان کے موضوعات کے سرے اکثر اُن موضوعات سے جا ملتے ہیں جو ترقی پسند شاعروں کے پسندیدہ موضوعات رہے ہیں۔ لیکن موضوعات کے کسی حصار میں خود کو قید نہ کر لینے کی روش انھیں جدید شاعروں کے موقف سے قریب کر دیتی ہے۔ ان کے ذہن و ذوق کی تربیت روایت کے سائے میں ہوئی لیکن نہ اُن کی سوچ روایتی ہے نہ اپروچ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں، خاص طور پر ان کی نظموں میں آج کے ان انسانوں کا دل دھڑکتا ہے جنھیں حسن سے بھی لگاؤ ہے' جنھیں زندگی بھی عزیز ہے۔

راہی کی شاعرانہ فکر میں جذبات بھی شریک ہیں اور شاید شریک غالب لیکن ان کا فنی شعور جذبات کو بے لگام نہیں ہونے دیتا اور یہی ان کی کامیابی ہے۔ وہ گہرا تاریخی اور تہذیبی شعور رکھتے ہیں جس کا شاید موثر ترین اظہار ان کی مشہور نظم ''ایک لمحہ'' میں ہوا ہے لیکن ان کی کامیاب نظموں میں شاید ہی کوئی نظم ایسی ہو جو اس شعور کی کارفرمائی کا اظہار نہ کرتی ہو۔ تہذیبوں کے گوناگوں مظاہر سے انھیں گہری دلچسپی ہے اور ان مظاہر میں وہ انسانی عظمتوں کا سراغ

لگانے کی کوشش کرتے ہیں، ان عظمتوں کی گم شدگی کا احساس ان کے دل و دماغ پر بار بار کچوکے لگاتا ہے اور ان کی بازیابی کی خواہش ان کے اندر بار بار سر اٹھاتی ہے۔ علم کی موجودہ ترقی اور سائنس کی ناقابلِ قیاس پیش رفت کا وہ کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں اور استقبال بھی مگر اس صورت حال کے منفی پہلوؤں تک بھی ان کی نظر رسا ہوتی ہے جنھیں علم کی بے لگامی اور سائنس کی بے پناہی نے جنم دیا ہے۔ موجودہ دور نے انسانیت اور انسانوں پر جو چیرہ دستیاں روا رکھی ہیں' طاقت اور اقتدار کے پرستاروں نے استحصال، ظلم اور جبر کی چکی میں اخلاقی قدروں کو جس طرح پیس کر رکھ دیا ہے اس سے راہی بہت دکھی ہیں اور ان کا یہ دُکھ کبھی کبھی شدید غصّے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ غصہ نہ صرف یہ کہ بیجا نہیں قابلِ تحسین بھی ہے البتہ جہاں جہاں یہ بے مہار ہو گیا ہے، وہ مقامات فکر پر جذبات کے کچھ زیادہ ہی غالب آ جانے کا اعلان کرتے نظر آتے ہیں مگر یہ مقامات کم ہی آتے ہیں' جو اس کا ثبوت ہے کہ شاعر فنی نظم و ضبط سے غافل نہیں۔

راہی کی نظموں پر حزن و حسرت کے سائے کم کم ہی پڑے ہیں لیکن ان کی غزلوں پر ایک غمناک فضا پوری طرح چھائی ہوئی ہے۔ انسانی وجود کی بے اساسی، زندگی کی بے ثباتی، اور ہر اُس چیز کی گریز پائی جو اِس فنا آباد عالم میں کیف و انبساط کی ضامن بن سکتی ہو، ان کی غزلوں کے خاص موضوعات ہیں۔ گزرتا ہوا وقت ہر قدم پر اُن یادوں اور خوابوں کو قعرِ فراموشی میں گراتا ہوا اپنا سفر جاری رکھتا ہے، جن کا ساتھ زندگی کو بامعنی بنانے کے لیے ضروری ہے۔ ماضی کی خوشگوار یادوں اور مستقبل کے خوبصورت خوابوں سے محروم انسان کی جو پرچھائیاں راہی کی غزلوں میں نظر آتی ہیں، ان پرچھائیوں کا گزر ان کی نظموں میں نسبتاً کم ہوا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ نظم جو ایک بیانیہ صنفِ سخن ہے، زمانے کی نیرنگیوں کے بیان کے لیے زیادہ موزوں ہے اور غزل کی داخلیت حدیثِ دل کے اظہار کی طالب ہوتی ہے۔ راہی کی حدیثِ دل حزن و حسرت سے عبارت ہے، حزن و حسرت کا یہ عنصر ان کی ان نظموں کا بھی غالب عنصر ہے جن میں ان کی نجی واردات کا اظہار ہوا ہے لیکن جن نظموں میں ذاتی نہیں کائناتی معاملات و مسائل بیان ہوئے ہیں، وہ اس عنصر سے خالی ہیں اور یہ ان نظموں کا تقاضا تھا۔ راہی کی غزلوں کے کچھ اشعار میں یہاں درج کر رہا ہوں:

چلو مانا، وفا کی راہ میں کانٹے ہی کانٹے ہیں
مگر کانٹوں سے ڈر کر چلنے والے کم نہیں ہوں گے
دوسروں کے غم میں روتی تھیں جو شمعیں، بجھ گئیں
آگ میں غیروں کی جلتے تھے جو پروانے، گئے
ابتدا یہ تھی کہ دنیا بھر کی نظریں ہم پہ تھیں
انتہا یہ ہے کہ خود سے بھی نہ پہچانے گئے
روتے روتے سو گئیں شمعیں بھی پروانوں کے ساتھ
رفتہ رفتہ مٹ گئے عنواں بھی افسانوں کے ساتھ
آشیاں برباد ہوتے دیکھ کر آیا خیال
ہم نے یہ تنکے چنے تھے کتنے ارمانوں کے ساتھ
رنگ دیکھے نہ گئے صبح کو میخانوں کے
ڈھیر ہی ڈھیر تھے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے
خاک اڑتی ہوئی دیکھی اسی دل میں راہی
جس میں میلے سے لگے رہتے تھے ارمانوں کے
گہنائے ہوئے چاند اور دھندلائے ہوئے سورج
فرقت میں ان آنکھوں نے کیا شام و سحر دیکھے
بلندی سے ہنسا کرتے تھے جو پستی نشینوں پر
ہوا بدلی تو وہ پستی کی جانب سر کے بل آئے
نغمے میں ہے اثر نہ کرشمہ ہے ساز کا
ہر شے میں دل دھڑکتا ہے نغمہ نواز کا
ہے پرتوِ جمال، دلیلِ جمالِ دوست
آئینہ خود ثبوت ہے آئینہ ساز کا
ہے گردشِ مقدر شاید یہی کہ اکثر
ہونٹوں تک آتے آتے پیمانے رہ گئے ہیں
کیا ایک ہی محور پہ ہے ٹھہری ہوئی دنیا
وہ جب بھی ملی ہے تو خفا ہم سے ملی ہے
وہ بت جو خدا آج بنے بیٹھے ہیں، ان کو
یہ شانِ خدائی بہ خدا، ہم سے ملی ہے
حوادث سے جو لرزاں تھے وہ راہی
حوادث سے بہلتے جا رہے ہیں
اے شمعِ صبح ہوتی ہے اب اپنی فکر کر
جلنا تھا جن کو آگ میں تیری وہ جل گئے
اک شامِ غم کو صبحِ مسرّت نہ مل سکی
کتنے ہی آفتاب چڑھے اور ڈھل گئے
کیا تعجب ہے کہ کچھ سوتے ہوئے جاگ اٹھیں
سونی بستی میں اک آواز لگائی جائے
کوئی امکاں، نہ تصوّر، نہ گماں تک کوئی

حادثہ ہوتے ہوئے ایسے بھی اکثر دیکھا
دل پہ کیا بیت گئی کس کو بتائیں راہی
جانے والے نے جو اک بار پلٹ کر دیکھا
کیا کرے پامال غم، اک یادِ ماضی ہی نہیں
حال کی بھی تلخیاں ہیں، فکرِ مستقبل بھی ہے

راہی کی غزلیں یادِ ماضی اور فکرِ مستقبل کے درمیان حال کی تلخیوں سے نبرد آزما جس کردار سے ہمارا تعارف کراتی ہیں وہ راہی کا ہمزاد نہیں تو ایسا ہمسایہ ضرور ہے جس کے جذبات و احساسات راہی کے جذبات و احساسات سے ہم آہنگ ہیں۔

جیسا کہ خود راہی نے مجھے بتایا ان کی پہلی نظم جس کا عنوان ''پیغام'' تھا ماہنامہ ''بیسویں صدی'' دہلی کے اپریل 1952 کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ علی گڑھ سے باہر انھوں نے پہلا مشاعرہ بھی دہلی میں پڑھا، یہ یومِ اقبال'' کا مشاعرہ تھا جس کا انعقاد پاکستانی سفارت خانے نے کیا تھا۔ راہی کی نظموں میں جو عوامی اپیل ہے اس کی ایک وجہ شاید اپنے کیریر کے آغاز میں ان کی صحافت سے وابستگی بھی ہے جو عوام کی نبض پہچاننے کی صلاحیت بخشتی ہے۔ دوسرے اخباروں میں کام کرنے کے علاوہ انھوں نے جے پور سے خود اپنا ہفت روزہ اخبار بھی ''بدلا ہوا زمانہ'' کے نام سے نکالا تھا۔ یہ اخبار انھوں نے 1971 میں نکالا تھا اور یہ 1975 تک نکلتا رہا۔

میں راہی کی کچھ نظموں کے بھی اقتباس پیش کرنا چاہتا تھا لیکن پھر خیال آیا کہ یہ نظموں کے ساتھ ایک قسم کی ناانصافی ہوگی، جہاں غزل کا ہر شعر اپنے آپ میں ایک اکائی ہوتا ہے، وہاں نظم تسلسلِ خیال کی حامل ہوتی ہے اور اس کی پوری معنویت تبھی کھلتی ہے، جب اس کا تمام و کمال مطالعہ کیا جائے۔ ان کی جو نظمیں مجھے بہ طور خاص پسند تھیں، ان میں سے چند کے عنوانات یہ ہیں: ایک لمحہ، واپسی، سفر، سیلاب، چراغ، تیسری جنگ، جنگ کیا ہے اور صدائے حسین۔ ان نظموں میں جذبہ اور فکر جس طرح ہم آہنگ ہوئے ہیں، اس کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

راہی سے مجھے ایک شکایت ہمیشہ رہی، انھوں نے مشاعروں کی شہرت و مقبولیت پر زیادہ تکیہ کیا، اپنے کلام کی اشاعت کی طرف کم توجہ کی۔ مشاعروں کی واہ واہ اپنی جگہ لیکن یہ جلد ہی فضا میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ مطبوعہ کلام دیر تک اور دور تک اپنے پڑھنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ راہی صاحب کی قومی نظموں کا ایک مجموعہ ''میرا وطن'' کے نام سے 1966 میں شائع ہوا تھا اور 1985 میں ان کی ایک طویل نظم'' کاروانِ آزادی'' بھی کتابی صورت میں آئی تھی۔ اس نظم میں جنگ آزادی کی تاریخ بیان ہوئی ہے اور اسے پڑھ کر راہی کی قدرتِ بیان کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے ان کی تمام تر شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اب وہ اپنے کلام کے ایک نمائندہ انتخاب کی اشاعت کی تیاریوں میں تھے کہ موت کا بلاوا آ پہنچا۔ اس انتخاب کی کتابت راہی نے اپنی زندگی میں کروائی تھی۔ راجستھان اردو اکادمی تو ان دنوں موجود نہیں ہے، اگر وجود میں آ جائے تو اس کا پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ راہی کے ورثا سے حاصل کر کے اسے شائع کر دے۔

□□□


## بدھ کی کہانیاں

**مصنف: اجیا کمار**

بودھ مذہب کے بانی مہاتما بدھ ایک عظیم انسان تھے جنھوں نے اپنی زندگی کو عملی نمونہ بنا کر عوام کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے ستیہ اور اہنسا کے اصولوں پر بے حد زور دیا اور ہر ذی روح کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے ساتھ پیش آنے کا درس دیا۔ کہانیوں کی یہ کتاب گوتم بدھ کی زندگی کے واقعات سے ترتیب دی گئی ہے۔

صفحات: 80 قیمت: -/65 روپے

## تینالی رمن کی کہانیاں

**مصنف: سی ایل ایل جیا پردا، مترجم: نامی انصاری**

شمالی ہند میں جس طرح بیربل کی حاضر جوابی اور ذہانت کی کہانیاں مشہور ہیں اسی طرح جنوبی ہند میں تینالی رمن کی کہانیاں زباں زد عام ہیں۔ وہ اپنی غیر معمولی ظرافت، عقل مندی، رحم دلی اور خوش تدبیری کے باعث وجے نگر کے راجا کرشن دیو رائے کا درباری شاعر بن گیا تھا اور کئی موقعوں پر اس نے راجا کی مشکلیں آسان کیں۔ اس کتاب میں ایسے ہی کچھ دلچسپ واقعات درج کیے گئے ہیں۔

صفحات: 72، قیمت: -/60 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

ابرار رحمانی

# قاضی سلیم ـــ ضمیر کی آواز کا شاعر

موت ہر ذی روح کا مقدر ہے قاضی سلیم کو بھی اس نے 7 رمئی کو اپنی آغوش میں لے ہی لیا۔ ہم ان کی موت پر افسوس کا اظہار قطعی نہیں کریں گے کہ یہ رسم، رسم سے زیادہ بدعت کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ پھر بھی ایک احساس ہے کہ جس کے اظہار کے بغیر رہا نہیں جاتا:

زمیں لوگوں سے خالی ہو رہی ہے
یہ رنگِ آسماں دیکھا نہ جائے

قاضی سلیم 27 رنومبر 1927 کو پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے۔ اور عثمانیہ یونیورسٹی سے ایل۔ ایل۔ بی۔ کیا تھا۔ انھوں نے بیک وقت ادب، سیاست اور سماج سبھی شعبوں میں دلچسپی لی، وران سبھی میدانوں میں انھوں نے اپنی شناخت قائم کی۔

قاضی سلیم پیشے سے وکیل تھے اور تقریباً پندرہ برس سے بیماری کے سبب گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ انھیں 1980 میں اورنگ آباد حلقے سے لوک سبھا کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ وہ دس سال تک مہاراشٹر کی قانون ساز مجلس کے رکن بھی رہے۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوا ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کا تعلق براہِ راست سرگرم عملی سیاست سے بھی رہا ہو۔ مولانا آزاد اور حسرت موہانی کے علاوہ قاضی صاحب نے اپنے حلقے اورنگ آباد کی بھرپور نمائندگی کی۔ وہ جب بھی دہلی اپنے ساؤتھ ایونیو کے ایم۔ پی۔ کوارٹر میں آتے تو وہاں بھی ملنے والوں میں ادیبوں اور شاعروں کا تانتا لگا رہتا اور کبھی کبھی غیر رسمی شعری محفل بھی جم جاتی۔

1968 میں قاضی سلیم کا پہلا مجموعہ ''نجات سے پہلے'' شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کی ایک مثنوی 'باغبان' و 'کف گل فروش' شائع ہوئی جو ان کے کلیات'' رستگاری'' میں شامل ہے۔ یہ تخلیق در اصل مثنوی کے فارم میں اپنے زمانے کی ہجو ہے۔ اس میں ادبی پیرائے میں سماج سیاست اور تمام معاصر مسائل پر قاضی سلیم نے اپنی برہمی اور تلخی کا اظہار کیا تھا۔ چناں چہ اس مثنوی میں طنز و استہزا کی لے کچھ زیادہ ہی تیز ہوگئی ہے۔ گو کہ قاضی سلیم ترقی پسند تحریک کے دور سے شاعری کر رہے تھے اور اپنے معاصرین میں انھوں نے اپنی شناخت بھی بنائی تھی۔ لیکن انھیں باضابطہ طور پر مسلم الثبوت شاعر کی حیثیت سے شمس الرحمٰن فاروقی نے'' نئے نام'' کے تحت پیش کیا۔'' نئے نام'' میں ان کی تین نظمیں'' وائرس''،'' وقت'' اور'' بے نظر میری آنکھیں'' شامل ہیں۔'' نئے نام'' اردو ادب میں رجحانات کی سطح پر میل کا پتھر ثابت ہوا کیوں کہ اس کے بعد سے جدیدیت کا رجحان تیزی سے عام ہوا۔ اس مختصر شعری مجموعے پر بہت گفتگو ہوئی ہے، حمایت میں بھی اور مخالفت میں بھی۔ حامیوں نے اسے جدید شاعری کا اصل نمائندہ قرار دیا تو مخالفین نے اسے چیستاں اور ترسیل و ابلاغ کا المیہ قرار دیا۔ لیکن قاضی سلیم کی شاعری بوجوہ ان تمام الزامات کے باوصف اپنی حیثیت منوانے میں کامیاب رہی۔ اگر یہ کہا جائے کہ نئے نام کے شاعروں میں قاضی سلیم کی شاعری نے سب سے زیادہ متوجہ کیا تو غلط نہ ہوگا۔

میں یہاں ان کی مذکورہ تین میں سے دو نظمیں نقل کر رہا ہوں تا کہ ان کے شعری بساط کی ایک جھلک سامنے آسکے۔ قاضی سلیم کی نظم'' وائرس'' ملاحظہ کریں.....

ابھی ابھی تو لب ملے تھے کتنے پیار سے
زباں پہ یہ کسیلا پن کہاں سے آگیا
مسیح وقت تم بتاؤ کیا ہوا
ذرا سی دیر کے لیے پلک جھپک گئی
تو راکھ کس طرح جھڑی

سنا ہے دور دیس سے
کچھ ایسے وائرس ہمارے ساحلوں پہ آگئے
جن کے تاب کار سحر کے لیے
امرت اور زہر ایک ہیں
اب کسی کے درمیان کوئی رابطہ نہیں
کسی دوا کا درد سے کوئی واسطہ نہیں

ہم ہوا کی موج موج سے
درد کھینچتے ہیں چھوڑتے ہیں سانس کی طرح
لہو کی ایک ایک بوند زخم بن گئی
رگوں میں جیسے بددعائیں تیرتی ہیں پھانس کی طرح

مسیح وقت تم بتاؤ کیا ہوا
دیو علم کے چراغ کا
کیوں بھلا بجھ گیا
دھواں دھواں بکھر گیا

سنو کہ چیختا ہے

''کام ...کوئی کام''

کچھ نہیں
جاؤ ساحلوں کی سمت ہو سکے تو روک لو
اس نئے عذاب کو
یا کروڑوں سال کے لیے
خدا کی آخری شکست تک
سمندروں کی ریت چھانتے رہو

قاضی سلیم کی دوسری نظم 'وقت' جو اس انتخاب میں شامل ہے، اس رخ ہے:

ایک
پھر دوسری
پھر تیسری
اور اب تو پیہم
گھڑگھڑاہٹ کی مسلسل چوٹیں
میرے اعصاب پہ پڑنے لگیں
تب ریل کی رفتار بڑھی
بھاگتے پیڑ
چٹانیں
کھمبے
پاس سے گزرے تو آواز ملا کر چیخے
شور ہی شور ہے
یہ شور مگر
اپنا اظہار ہے اثبات ہے ہر شئے کے لیے
آسماں سرخ ہے
اب بھی وہ ستارا تنہا
نگراں ہے مرے ہر کرب کا
یہ کہتا ہے
''عمر اک چیخ کی میعاد ہے
تم بھی چیخو------------
اتنی شدت سے کہ مدت تک
وقت کو یاد رہے
جنگلوں اور پہاڑوں میں یہ فریاد رہے''

آہنی پہیوں نے 'فولادی زباں میں اپنی
بات دہرائی' یہ آواز تھی جانی بوجھی
ایسے مانوس تھے الفاظ جنھیں عمر تمام
سنتے رہتے ہیں مگر سیکھ نہیں پاتے ہیں
آج بھی دیر تلک سنتا رہا
تاپے
ساعتیں
شام اور سحر
منزلیں کتنی رہیں ... وقت چلا
دھیرے دھیرے میری رگ رگ میں لہو کی گردش
دور و نزدیک سے درد کشاکش سے ملی
گھڑگھڑاہٹ سے ہم آہنگ ہوئی
اب ہوں میں جزو اسی کا شاید
آہنی پہیہ ہوں' اک ایسا تسلسل ہوں
کہ جس کے کوئی معنی ہی نہیں

پچھلی ضربات سے ہر ضرب نئی
ایسے مل جاتی ہے جیسے اس میں
کسی احساس کا فریاد کا وقفہ بھی نہیں

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ 1967 میں 'نئے نام' شائع ہوا جس میں ان کی ادبی انگڑائی کی ایک جھلک نظر آتی ہے اور 1968 میں ان کا شعری مجموعہ ''نجات سے پہلے'' شائع ہوا اور اس کی بدولت وہ عصری ادبی منظر نامے میں اپنا اہم مقام بنانے میں کامیاب رہے۔ یہ وہ دور تھا جب نظمیہ شاعری میں افتخار جالب، باقر مہدی، بشر نواز، بلراج کومل، بمل کرشن اشک، حمید الماس، راج نرائن راز، زبیر رضوی، شاذ تمکنت، سلطان اختر، شہاب جعفری، شہریار، عادل منصوری، کمار پاشی، محمد علوی، محمود ایاز، مخمور سعیدی، مصحف اقبال توصیفی، وحید اختر اور وہاب دانش جیسے اہم نام شامل تھے، اور جنھوں نے غزل گوئی پر نظم نگاری کو ترجیح دی لیکن ان میں سے بیشتر کے یہاں ابہام اور لامعنیت نظر آتی ہے۔ 1968 میں ہی قاضی سلیم نے ایک ادبی جلسے میں ایک ادبی منشور پیش کر دیا جس میں انھوں نے ایک طرح سے ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں سے ہی بیزاری کا اظہار کیا تھا۔ قاضی سلیم کو اپنا یہ ادبی منشور اس قدر عزیز رہا کہ جب 2003 میں یعنی پورے پینتیس (35) سال بعد نورالحسنین کے اشتراک سے ایک سہ ماہی رسالہ ''دل رس'' کا اورنگ آباد سے اجرا کیا تو اس رسالے میں پھر سے ایک بار وہ منشور پیش کیا کہ ان کی نظر میں یہ ہر دور کے لیے قابل قبول ہے۔ میں نے ''دل رس'' کے اس شمارے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

''رسالے میں ایک خاص چیز اس کا افتتاحیہ ہے جس کی وجہ سے رسالہ ''دل رس'' کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ قاضی سلیم نے اپنے افتتاحیہ میں

1968 کے ایک جلسے میں جدید شاعری پر پیش کیے گئے اس چھ نکاتی منشور کو پھر سے پیش کیا ہے جسے قاضی صاحب نے ہر عہد کی اچھی شاعری کے لیے میزان سے تعبیر کیا ہے:

1. ذات اور شعور کی ساری پناہ گاہیں پاش پاش ہو کر بکھر گئی ہیں۔ اس صورت حال سے نکلنے کے لیے پنڈورا کے صندوق میں ایک ہی امید بچی ہے اور وہ ہے آرٹسٹ کا ضمیر، اس لیے ہم تمام فلسفوں اور نظریوں میں زندہ ضمیر کے آگے جوابدہ ہیں۔

2. ہم زندگی کے دوسرے شعبوں کے متوازی، فن کے علاحدہ وجود کا اثبات کرتے ہیں۔ اس میکانکی جبریت کے عہد میں ہم آرٹ کی جمالیاتی اور سماجی ضرورت پر گواہی دیتے ہیں۔

3. ہم مبہم تعمیمات (Vague Generalisation) کی بجائے اپنے ذاتی ردِ عمل کے اظہار کو فن کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہماری شاعری بھی ہماری صورتوں کی طرح مختلف اور منفرد ہوگی۔

4. ہم گھسے پٹے درسی معیارات سکہ بند انداز بیان اور زیبائشی لفظیوں کی بجائے اظہار و بیان کے ہر نئے امکان کو لبیک کہتے ہیں۔ اس لیے لفظ، استعارے، علامتیں یہ سب زبان کی توسیع کا وسیلہ ہوں گے۔

5. ہم ترسیل و ابلاغ کو فن کا ایک چیلنج سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ یہ چیلنج تخلیق کار اور قاری دونوں کے لیے ہوگا۔

6. ہم روایات کا احترام کرتے ہیں، چاہے وہ ہماری روایات ہوں یا کسی اور زبان سے حسن و آہنگ کی صورت میں زماں و مکاں کو پھلانگتی، ہم تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی ہوں۔" (ماہنامہ "یوجنا" نئی دہلی، اکتوبر 2003)

مندرجۂ بالا منشور کے نکات پر بحث کی پوری گنجائش ہے اور ہمیں اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ اس منشور میں قاضی سلیم نے فنکار کے ضمیر اور ضمیر کے تئیں جواب دہی کی بات کی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ایک فن کار کا اپنے ضمیر کے تئیں جوابدہ ہونا ہی اس کے سچے اور کھرے ہونے کی دلیل ہے۔ یہی وہ حدِ فاصل ہے جو فنکار اور غیر فنکار (یا نام نہاد اداکار) میں فرق کرتا ہے۔ یہی وہ ضمیر اور ضمیر کے تئیں جواب دہی کا احساس ہے جو اس کے فن کو پائیدار زندہ اور پائندہ بنا دیتا ہے۔ ادیبوں کے بھیس میں غیر ادیب کے فن پارے اسی وجہ سے بہت جلد بھلا دیے جاتے ہیں یا وہ خود طاق نسیاں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ قاضی سلیم کی مشہور نظم "بے ضمیری" ملاحظہ کیجیے:

زمیں گھومی
ہوا بدلی
چلو موسم بدلتا ہے
سلیم اب تم پہاڑوں سے اتر آؤ
وہ دیکھو چیونٹیوں کے پر نکل آئے
فضائے بیکراں میں
موت کی وادی میں
اڑتی پھر رہی ہیں آج کتنی بے نیازی سے
کہ جیسے مطمئن ہیں مکڑیوں کی سرفرازی سے
سلیم اب تم پہاڑوں سے اتر آؤ
تمھاری دور کی آواز کیسے گونج بن کر
پلٹ آئی ہے
شاید بستیوں کے سبھی بارود گھر سیلے ہوئے ہیں
کوئی ہتھیار صحیح سالم نہیں ہے
نکیلے دانت، کانٹے، ڈنک، ناخن
حفاظت کے سبھی سامان جیسے چھن چکے ہیں
اندھیرے کی پناہ گاہوں میں
سحر سامری سے
آج سب مبہوت ہیں
ہاتھ پاؤں ذہن سب مفلوج ہیں
سونے کا بچھڑا بولتا ہے
کبھی تو ظالموں سے درد کا رشتہ جڑا کر
خدا کی گود میں آرام سے سوتے ہیں جب سب پیمبر
یہ کس کا درد سہتے ہیں
یہ کس کا پاس رکھتے ہیں
خود اپنی موت کی نظارگی کا زخم دے کر
درندوں کی نگاہوں سے
الوہی روشنی کی آس رکھتے ہیں
سلیم اب تم پہاڑوں سے اتر آؤ
تمھارے راز تم ہی جانتے ہو
یہ سب کچھ جھوٹ ہے، اک ڈھونگ ہے
ہم میں کوئی
ایوب ہے، بدھ ہے، نہ عیسیٰ ہے۔
بس اتنا ہے
تمھارا اپنا شیطاں مر چکا ہے

اس نظم میں زمین کا گھومنا، ہوا کا بدلنا، موسم بدلنا، پہاڑوں سے اتر آنا، چیونٹیوں کے پر نکل آنا، مکڑیوں کی سرفرازی، بارود گھر کا سیلنا، نکیلے دانت، کانٹے، ڈنک، ناخن وغیرہ علامات و استعارات سے شاعر نے کام لیتے ہوئے زمانے کی بے ضمیری پر بھرپور وار کیا ہے۔ اسی طرح ایوب، بدھ اور عیسیٰ کا صرف نام لے کر خوب صورت تلمیحات استعمال کی ہیں۔ اپنے خوب صورت ڈکشن، اسلوب اور پیرایۂ اظہار کے سبب یہ نظم اس وقت کافی مقبول ہوئی تھی۔ گیان پیٹھ نے 1985 میں ہندوستانی زبانوں کی شاعری کے انتخاب

'' بھارتیہ کویتائیں'' میں نظم '' بے ضمیری'' کو بطور خاص شامل کیا ہے۔

قاضی سلیم نے اس میکانکی جبریت کے عہد میں آرٹ کی جمالیاتی اور سماجی ضرورت پر زور دیا ہے۔ قاضی سلیم ترقی پسند تحریک کے دور میں بھی فعال تھے اور جب جدیدیت کا زمانہ آیا تو وہ یہاں بھی فعال رہے۔ ان کا خاص کمال یہ ہے کہ انھوں نے ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کی اچھائیوں اور خوبیوں کا حسین امتزاج پیش کیا۔ چنانچہ وہ نہ صرف اپنے معاصرین کو آرٹ کی جمالیاتی اور سماجی ضرورت کا احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ ان کی شاعری بھی خود اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ ان کی نظم '' دوسری کربلا'' اس پس منظر میں خاص اہمیت رکھتی ہے:

کوکھ صحرا کی کتنی ہری ہے
کیلشس کے ابھرتے ہوئے ہاتھ
----ہاتھوں میں
کانٹوں بھری انگلیاں
کانٹوں بھری انگلیوں سے
چھوٹتے -- انگنت ہاتھ
----ہاتھوں میں
کانٹوں بھری انگلیاں
کیا تم نے دیکھے ہیں
وہ پیڑ جو بے زمیں ہیں
اپنے ہی جسم میں دوڑتی
بے محابہ جڑیں
پتھروں کی رگیں
جانتی ہیں
روئیدگی کے خزانے
شہیدوں کے خون میں
چھپے بارود خانے
اے خدا
ہجرتوں کی گھڑی ہے
سرزمیں تیرے وعدے کی
---شاید قریب آچکی ہے
کوئی جی کر دکھائے
موت پر فتح پانے کے ارمان میں
یہ تو تیرا کرم ہے
زیست کا دودھ اترا ہے
بگولوں کے پستان میں
کینہ پرور ہواؤں کی سازش کو
----سب جانتے ہیں
شاید اسی واسطے
آج اتنا لہو جسم میں جوڑ رکھا ہے
----جو چیر دو تو اس زندگی کا
----ٹپ ٹپ گرے
کانٹتے جاؤ
کانٹوں بھری انگلیوں سے
جسم سالم ابھر آئیں گے
جسم سے پھوٹتے
انگنت ہاتھ
ہاتھوں میں
کانٹوں بھری انگلیاں

قاضی سلیم علامات و استعارات کا خوب استعمال کرتے ہیں لیکن مبہم تمہیمات کے قائل نہیں۔ حالاں کہ یہ ان کے دور کا غالب رجحان رہا۔ مبہم تمہیمات کے دور میں بھی اپنے ذاتی ردعمل کو ہی انھوں نے فن کی بنیاد قرار دیا۔ انھوں نے اسے ایک انتہائی خوب صورت تشبیہ کے ذریعے سمجھاتے ہوئے کہا کہ ہماری شاعری بھی ہماری صورتوں کی طرح مختلف اور منفرد ہونی چاہیے۔

قاضی سلیم ہمیشہ اظہار و بیان کے نئے امکانات تلاش کرتے رہے۔ چناں چہ انھوں نے گھسے پٹے درسی معیار اور سکہ بند انداز بیان اور زیبائشی لفاظیوں سے نہ صرف خود اجتناب کیا بلکہ اس کی تلقین بھی کی۔ انھوں نے لفظ، استعارے اور علامات کو محض زبان کی توسیع کا وسیلہ گردانا ہے۔

قاضی سلیم جس زمانے میں اپنے فن کے عروج پر تھے اور اختر الایمان وغیرہ کے بعد ان کی شاعری کا شہرہ تھا، اس زمانے میں بھی انھوں نے اپنی تخلیق کو چیستاں نہیں بننے دیا۔ یہ وہ دور تھا جب ہر شخص علامت نگاری کے فیشن میں ترسیل و ابلاغ کی ناکامی کا شکار ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں انھوں نے فیشن کے ساتھ رہتے ہوئے بھی فن کی ترسیل اور ابلاغ کے اس عصری چیلنج کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اس سے نمٹنے کی بھرپور کوشش بھی کی اور اس میں بڑی حد تک وہ کامیاب رہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انھوں نے ان تمام مسائل سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف اپنی روایات کا پاس و لحاظ رکھا بلکہ دوسری زبانوں کی روایات کو بھی عزیز جانا اور اس کے حسن آہنگ کو اپنایا جو بلاشبہ کبھی ترجموں کی صورت میں تو کبھی تبادلۂ خیالات سے ہم تک پہنچتی رہی ہیں۔ آج قاضی سلیم ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن ان کے افکار و خیالات اور تخلیقات ہمارے ساتھ ہمیشہ رہیں گی۔

□□□

Tazeen Apartt. 179/22, Zakir Nagar,
New Delhi-110025

مصطفیٰ علی اکبر

# نصف صدی کا ساتھ نصف گھنٹے میں ختم

## (آمنہ ابوالحسن کی یاد میں)

ہماری ملاقات 1954 میں ہوئی تھی، دن تاریخ مجھے اب یاد نہیں۔ معظم جاہی مارکیٹ کے بیچلرز کوارٹر کے کمرہ نمبر 17 میں جہاں سلیمان اریب "صبا" کا دفتر بھی تھا۔ وقتاً فوقتاً ادبی اجلاس ہوا کرتے تھے۔ ان میں سلیمان اریب کے علاوہ شاہد صدیقی اور حسینی شاہد اور دوسرے بہت سے شاعر، ادیب، اخبار نویس اور دانشور شریک ہوا کرتے تھے۔ ان دنوں میں حیدرآباد نیوز کے نام سے اردو خبروں کی ایجنسی چلایا کرتا تھا۔ ان ہی دنوں میں نے دیکھا کہ ایک سانولی سلونی، دبلی پتلی لڑکی بھی وہاں آتی ہے جو اپنی کہانی سنا کر چلی جاتی ہے۔ آمنہ ابوالحسن نامی اس لڑکی میں خاص بات اس کی آنکھیں تھیں۔ بے حد دلکش اور بولتی ہوئی طرح دار آنکھیں۔ میں ان سے بے حد متاثر تھا اور کچھ دنوں بعد یہ آنکھیں دن رات میرا پیچھا کرتی رہیں آخر تنگ آکر میں نے اس لڑکی سے بات چیت شروع کی۔ بات چیت اس طرح آگے بڑھی کہ پوری پوری رات ہم دونوں میں ٹیلی فون پر بات ہوا کرتی تھی پھر ایک دوسرے کے پاس چٹھیاں آنے لگیں۔ رات بھر باتیں کرنے اور دن بھر اس لڑکی کی چٹھی کا انتظار کرنا زندگی میں یہی ایک مشغلہ باقی رہ گیا تھا۔ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا اور بیچلرس کوارٹرس میں کہانی سنتے سنتے اب خود ہماری کہانی کا آغاز ہوگیا تھا۔ ہم دونوں کی عمریں بیس، بائیس کے آس پاس ہی تھیں پھر ہم نے سوچا کہ ٹیلی فون اور چٹھیوں سے ہٹ کر اور اور ینٹ ہوٹل یا حسین ساگر کے کنٹے پر ملاقات کے بجائے زندگی ساتھ گزارنے کا راستہ تلاش کیا جائے کیونکہ اس وقت ہم دونوں کو صرف ہم دونوں نظر آتے تھے، دن میں بھی اور راتوں میں بھی۔ پھر ایک دن میرے چند بزرگوں نے جا کر اس لڑکی کے والد سے ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ اس لڑکی کی شادی مجھ سے کر دی جائے۔ اس لڑکی کے والد سے میرے بزرگوں کے دوستانہ تعلقات تھے اور انھوں نے اس تجویز سے اتفاق کرلیا لیکن اس سے قبل کہ شادی ہوتی، لڑکی کے والد ابوالحسن سید علی صاحب کا اچانک ممبئی میں انتقال ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ اس سانحے نے لڑکی کے خاندان کو پریشان کر دیا تھا اور کچھ دنوں بعد اس لڑکی نے مجھے بتایا کہ اس کے گھر والے اس شادی کے خلاف ہیں کیونکہ میں سنی ہوں اور لڑکی کا خاندان مہدوی ہے۔ ساتھ ہی خاندان کے کچھ افراد نے یہ بھی کہہ دیا کہ میں اس لڑکی کی دولت کی خاطر شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ان دنوں لڑکی کے والد کی جائداد کم از کم 2 کروڑ مالیت کی تھی۔ بہر حال کئی دنوں تک اٹل رہنے اور ہماری جانب سے یہ یقین دلانے کے بعد کہ پوری جائداد میں سے ہمیں کچھ بھی نہیں چاہیے، آمنہ کے بھائی، بہنوں نے شادی پر رضامندی ظاہر کر دی اور بے حد سیدھے سادھے طریقے سے 25 مارچ 1955 کو حمایت نگر کے ایک مینار کی مسجد میں ہماری شادی ہوگئی۔ چونکہ ہم نے کچھ بھی نہ لینے کا یقین دلایا تھا اس لیے حقیقت میں کچھ بھی جہیز میں نہیں دیا گیا تھا۔ اس پر بھی ہم میں کوئی ناراضگی نہیں تھی۔ ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ ہماری شادی ہوگئی ہے تو ہمیں جنت کی خوشی میسر ہوگئی۔ دن خوشی اور مسرت سے کٹتے رہے۔ کم آمدنی کا ہمیں غم نہیں تھا۔ آمنہ اپنی تحریروں میں اور میں صحافتی بھاگ دوڑ میں گزارا کر رہا تھا۔ تھوڑے دنوں بعد آمنہ کی کہانیوں کا مجموعہ "کہانی" شائع ہوا۔ اس کے بعد سیاہ، سرخ سفید نام کے ناول کی اشاعت ہوئی۔ آمنہ کو شروع سے ہی اپنی تشہیر کا کوئی جنون نہیں تھا۔ وہ تو صرف لکھنا جانتی تھیں۔ حیدرآباد کے دورے پر اردو کے مشہور ناقدین آیا کرتے تھے اور حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کی طرف سے ان کی خوب خوب پذیرائی ہوتی تھی۔ دعوتیں ہوتیں، انھیں کھلایا پلایا جاتا اور ان کے ذہنوں میں اپنے نام نقش کروائے جاتے لیکن آمنہ کو یہ قطعی منظور نہ تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ دعوتیں کھلا کر اگر بڑا ادیب یا شاعر بننا ہے تو انھیں یہ بات نامعقول لگتی ہے۔ انھیں اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ خود ساختہ نقاد، ان کی تحریروں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ جب بھی ان کی کوئی کتاب، میں شائع کراتا انھیں چند دنوں کی خوشی ہوتی اور اس کے بعد سب بھول بھال جاتیں کہ ان کی تحریروں کو کتابی شکل دے دی گئی ہے۔ ان ہی دنوں حیدرآباد کے ادیبوں کی ایک ڈائری شائع ہوئی جس میں آمنہ کا کوئی ذکر ہی نہیں تھا حالانکہ اس ڈائری کے مصنف اور ڈائری شائع کروانے والوں کے ہم سے بہترین تعلقات تھے۔ آمنہ کی تحریروں کا سفر ان کے بچپن سے شروع ہوا تھا۔ ریاست حیدرآباد کی ہند۔ یونین میں شمولیت سے پہلے جناب مسلم ضیائی کی ادارت میں بچوں کا ایک رسالہ "تارے" شائع ہوا کرتا تھا اور اس رسالے میں آمنہ کی کہانیاں شائع ہوتی تھیں۔ اس طرح وہ بچپن سے ہی کہانی نویس ہوگئی تھیں پھر بھی حیدرآباد کے ادیبوں کی فہرست میں ان کا نام شامل نہیں کیا گیا تھا۔ یہ صرف سیاست اور خوشامد پرستی کا نتیجہ تھا جس سے آمنہ کو کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس ڈائری کی اشاعت کے بہت دنوں بعد تک آمنہ کو سخت رنج و ملال ہوا۔ اس واقعے نے آمنہ کے ذہن کو ہی

بدل ڈالا۔ اب انھیں کسی تعریف یا کسی نام کی خواہش بالکل نہیں رہی تھی۔ چند دنوں بعد ہمیں دلی کا رخ کرنا پڑا۔ وہاں مجھے آل انڈیا ریڈیو میں نیوز ریڈر کی نوکری مل گئی تھی اور ہمیں دلی میں رہنا تھا۔ وہاں ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ آمنہ کے ریڈیو سے مسلسل پروگرام آنے لگے اور شمالی ہند کے رسالوں میں انھیں شایانِ شان طریقے سے شائع کیا جانے لگا۔ دلی میں رہ کر آمنہ نے مزید پانچ کتابیں شائع کیں۔ بے حساب کہانیاں، ڈرامے، مضامین لکھے۔ دلی، اتر پردیش، بہار اور مدھیہ پردیش کی اردو اکادمیوں نے ہر کتاب پر نقد انعامات دیے۔ صرف آندھرا پردیش اردو اکادمی نے آمنہ کی تحریروں کو قابلِ اعتنا تصور نہیں کیا۔ مغربی بنگال کی ایک انجمن جو ہر سال کسی دوسری زبان کی ادیبہ یا ادیب کو ایک انعام دیتی ہے اس نے اردو کے لیے آمنہ کا انتخاب کیا۔ وہاں سے ایک نمائندہ دلی آیا اور درخواست کی کہ آپ کلکتہ آیئے اور انعام حاصل کیجیے۔ آمنہ نے معذرت کی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی آمد و رفت اور قیام کا خرچ بھی اکادمی دے گی۔ بنگالی زبان کی اس اکادمی نے آخر کار اپنے نمائندے سے ایک ٹرافی اور ایک چیک بھیج دیا۔ راجیو گاندھی نے خود سے فرمائش کر کے آمنہ کی دو کتابوں کی رسمِ اجرا انجام دی۔ 1966 میں ہم دلی گئے تھے اور شادی کے گیارہ سال ہونے کے باوجود ہماری کوئی اولاد نہیں تھی۔ ہمیں اولاد کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ لیکن شادی کے سترہ سال کے بعد 2 راگست 1972 کو ہمیں ایک لڑکی نیلوفر ہوئی اور اس سے ایک سال بعد ہی یعنی 17 راگست 1973 کو دوسری لڑکی صنوبر نے جنم لیا۔ بدبختی سے بڑی لڑکی کو کوئی دماغی تکلیف تھی جس کا آپریشن بھی کروایا گیا۔ آپریشن کامیاب رہا لیکن قدرت کا کھیل یہ کہ آدھی رات کو ایک ٹانکا ٹوٹ گیا اور دو بوتل برابر پانی بہہ گیا۔ بس اس طرح دماغ کو ایسا دھکا لگا کہ نیلوفر بولنے سے محروم ہوگئی اور اس کی دیکھ ریکھ ایک مستقل کام بن گیا اور آمنہ اس کام میں جٹ گئیں۔ پھر تو انھیں سوائے لکھنے پڑھنے اور بچی کی دیکھ بھال کرنے کے کوئی اور کام نہیں رہ گیا تھا۔ دنیا کے سارے کاروبار انھیں غیر ضروری اور بیکار لگنے لگے۔ چھوٹی لڑکی، خدا کے فضل سے بے حد سمجھدار، ہوشیار اور صحت مند تھی جس نے اپنی محنت سے نام کمایا، ریڈیو میں انگریزی نیوز ریڈر کی نوکری حاصل کی اور ریڈیو ہی میں FM میں کام کرنے والے بے حد شریف، لائق اور خاندانی لڑکے سے شادی بھی کر لی۔ ان کی اب ایک لڑکی بھی ہے۔ دن یوں بھی اچھے گزرتے رہے 35 سال تک نوکری کرنے کے بعد میں نے ریٹائرمنٹ لے لیا لیکن دلی میں ہی رہے کہ اچانک ایک دن آمنہ کو سخت بخار آیا تو اسپتال کے ICU میں رکھنا پڑا۔ اب میرا خیال بھٹکنے لگا۔ میں اور بیوی، کمزور ایک Retarted لڑکی کس طرح دلی میں رہیں گے۔ چھوٹی لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ میں نے اچانک فیصلہ کیا کہ دلی چھوڑ دینے کا وقت آ گیا ہے اور میں جو بے سروسامان دلی گیا تھا بہت سا سامان لے کر حیدرآباد آ گیا۔ آمنہ کو بیماری کے بعد بہت سی باتیں یاد نہیں رہتی تھیں لیکن صحت ٹھیک تھی۔ حیدرآباد آنے کے ایک سال بعد چھوٹی لڑکی اور داماد بھی حیدرآباد آ گئے اور اس طرح وہ ہمارا سہارا بن گئے۔ دلی میں ہم نے قابلِ رشک زندگی گزاری۔ آمنہ کو پہننے اوڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ سلیقہ مند ایسی کہ اگر کوئی بچہ بھی مہمان آ رہا ہو تو سارے گھر کی صفائی کے ساتھ ساتھ چادریں، صوفہ، غلاف، برتن اور تو اول وغیرہ کی نئے سرے سے صفائی کرتیں۔ کھانے میں انھیں میٹھا بے حد پسند بلکہ ضروری تھا۔ پہلے وہ بیگم اختر، مہدی حسن، غلام علی وغیرہ کی غزلیں اور پاکستانی قوال غلام فرید اور ساتھیوں کی قوالی خاص طور پر ''تاجدارِ حرم'' کے ریکارڈ سنا کرتی تھیں لیکن حال میں وہ صرف ٹی وی سیریل دیکھنے لگی تھیں۔ شام سات بجے سے رات گیارہ بجے تک وہ ٹی وی کے سامنے ہوتیں اور بعد میں سونے جاتیں۔ اس طرح ان کی دلچسپیاں بہت بدل گئی تھیں۔ انھیں روز شام میں سیر کرنے کا بڑا شوق تھا اور ان کی فرمائش پر شام میں گاڑی لے کر انھیں باہر گھمانا پڑتا تھا لیکن حال میں وہ اس سے بھی تھک گئی تھیں۔ لکھنا تو انھوں نے تین چار برس سے چھوڑ دیا تھا۔ کوئی چھ ماہ قبل انھوں نے اپنے سارے مسودے صندوق سے نکال کر جلا دیے۔ حد یہ کہ جو شائع شدہ کتابیں ان کے پاس تھیں وہ بھی کباڑیے کے حوالے کر دی گئیں۔ میں کہتا ہی رہ گیا لیکن انھوں نے کہا کیا کریں گے رکھ کر کوئی پڑھنے والا تو ہے نہیں۔ بیماری کوئی نہیں تھی سینہ میں بلغم جمنے کی شکایت کبھی کبھی ہوا کرتی تھی۔ امتحان سارے کروالیے۔ نہ بلڈ پریشر تھا نہ ذیابیطس۔ دلی والی بیماری کے بعد ان کی صحت پہلے جیسی نہیں رہی تھی لیکن حسبِ معمول کام وہ برابر انجام دے رہی تھیں۔ شروع سے ان کی عادت تھی کہ معمولی سی معمولی بات بھی وہ اپنی ڈائری میں لکھ کر رکھتیں۔ 7 اپریل کو انھوں نے کہا کہ سینہ پھر بھر گیا ہے۔ میں نے دوا دی اور لٹا دیا۔ کہنے لگیں اب آرام ہے۔ 8 راپریل کی رات کو کہا مجھے چکر آ رہا ہے۔ میں نے کہا چلو صبح ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ سو گئیں۔ 9 راپریل کی صبح چھ بجے میرے کمرے میں آئیں اور میرے بستر کے بازو کے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ میری آنکھ کھلی تو پوچھا کیا بات ہے۔ انھوں نے ایک کاغذ میرے حوالہ کر دیا اس پر صرف لکیریں تھیں۔ میں نے پوچھا کیا ہے پڑھی نہیں جا رہی ہیں۔ کہنے لگیں میں نے لکھا ہے۔ ڈاکٹر کو بلاؤ اور کھانسی کی سیرپ لا دو۔ میں نے کہا کہ بیٹی داماد کو جگاتا ہوں، ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ پھر پوچھا چائے پیو گی، بنادوں۔ کہا ہاں۔ میں نے دو کپ چائے بنائی ایک انھیں دی اور ایک میں نے لی۔ میرے ساتھ بیٹھ کر آدھی کپ چائے پی، پھر کہا کہ میں Toilet جاؤں گی۔ میں نے کہا جایئے۔ اپنے کمرے سے میرے کمرے میں آئیں پھر ٹائلٹ گئیں۔ واپس آئیں تو بیٹی داماد، ڈرائنگ روم

میں آگئے تھے۔ وہاں آکر بیٹھ گئیں لیکن سر جھکا کر رکھا۔ داماد نے کہا کہ ممی آپ میز پر کیوں بیٹھی ہیں یہاں صوفے پر آجایئے۔ وہ وہاں سے اٹھ کر داماد کی جانب بیٹھ گئیں۔ میں نے کہا گردن درد دے گی آپ بستر پر لیٹ جایئے۔ سن کر کھڑی ہوگئیں اور اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے کہا کیا ہے۔ کہا مجھے سہارا دو۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر بستر تک پہنچایا اور کہا کہ لیٹ جایئے لیکن کچھ دیر ایسی ہی بیٹھی رہیں پھر آدھا لیٹ گئیں۔ بیٹی نے کہا ممی سیدھا لیٹ جایئے، تو پاؤں سیدھے کرلیے۔ اس کے بعد مجھے لگا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ بیٹی کو آواز دی، صنوبر نے آکر دیکھا تو سانس نہیں تھی۔ داماد نے گود میں اٹھا کر گاڑی میں ڈال کر اسپتال پہنچایا۔ وہاں ڈاکٹر نے کہا یہ تو گزر چکی ہیں۔ اس طرح نصف صدی کا ساتھ صرف نصف گھنٹے میں ختم ہوگیا کیونکہ 25 مارچ 2005 کو ہماری شادی کے پچاس سال ہوگئے تھے اور اس کے بعد صرف نو دن وہ رہیں اور زندگی کی کشاکش کو خیرباد کہہ کر مالک حقیقی سے جاملیں۔ نہ کوئی بیماری نہ اسپتال کا چکر نہ ہمیں کوئی تکلیف دی نہ خود کوئی تکلیف اٹھائی۔ ایسا لگتا ہے کہ شادی کے پچاس سال پورے کرنے کے لیے وہ زندہ تھیں اور اس کے ایک ہفتے کے بعد انھوں نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ پچاس سال ایک چھت کے نیچے گزارنے کے بعد اچانک اکیلے ہو جانا خدا کا قہر جیسا ہے۔ بہرحال اس بات کا اطمینان ہے کہ بے حد شاندار زندگی گزارنے کے بعد آمنہ نے زندگی کو خیرباد کہہ دیا۔ خدا مغفرت کرے۔ آمین

(بشکریہ "منصف" حیدرآباد، 24/اپریل 2005)

□□□


## تحریکِ خلافت

**مصنف: قاضی محمد عدیل عباسی**

ہندستان میں چلائی جانے والی تحریک خلافت نے بالواسطہ طور پر ہماری تحریک آزادی کو بھی ایک نئی قوت عطا کی تھی۔ اس کتاب میں مصنف نے جو اس تحریک میں شریک تھے، تحریک خلافت کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 219 صفحات، قیمت 65.00 روپے

## تالستائے

**مصنف: ڈاکٹر محمد لیٰسین**

تالستائے کی تصانیف ہمیں خواب وخیال کی دنیا سے حقیقت کی طرف لے جاتی ہیں۔ اس کے یہاں حیات وکائنات کا عرفان بھی ہے اور عام انسانی جذبات واحساسات کی عکاسی بھی۔ اس کتاب میں تالستائے کے سوانحی گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے فنی کارناموں پر بھی۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 152 صفحات، قیمت 46.00 روپے

## بابرنامہ

**تلخیص کار اور مترجم: ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی**

"تزک بابری" کی تلخیص اور آسان اردو میں ترجمہ۔ یہ تلخیص ان حصوں پر مشتمل ہے جن میں بابر نے بہ طور خاص ہندستان کے رسم ورواج، یہاں کے موسموں، یہاں کی آب وہوا یہاں کے پھلوں اور پھولوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لیے خصوصی دلچسپی کی حامل ہے۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 101 صفحات، قیمت 15.00 روپے

## برنارڈ شا

**مصنف: عبدالمغنی**

جارج برنارڈ شا ایک روشن خیال اور انسان دوست ادیب اور مفکر تھا جو نسل یا قومیت کی حدبندیوں سے نکل کر پورے عالم انسانیت کی بہتری کا خواہاں تھا۔ اس کتاب میں برنارڈ شا کے شخصی اور ادبی اوصاف تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 96 صفحات، قیمت 35.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مصنفہ: سُدھا مورتی
مترجم: ابوالکلام

ہماری مطبوعات ''عکس اور برعکس'' (زندگی کو سلام) سے اقتباس

# بشری خامیاں

برسوں پہلے میں بطور چیف سسٹم انالسٹ کے کام کررہی تھی۔ اس ملازمت میں پروجیکٹ کے کام کے لیے اچھی خاصی مسافت شامل تھی، کبھی ایک چھوٹے گاؤں کا تو کبھی پڑوس کے شہر کا سفر کرنا پڑتا۔ اکثر کام کا دباؤ چھٹیوں میں بھی سفر کرنے کے لیے مجبور کرتا۔

جمعے کے روز طویل Week-end کے لیے میں تیار ہورہی تھی۔ آنے والے دو شنبہ کے دن کسی تہوار کی چھٹی تھی اور اس موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم بہنوں نے اپنے آبائی وطن شیگاؤں میں اپنی دادی کے گھر پر ملنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جمعے کے دن کے اختتام کا میں انتظار کررہی تھی۔ اتوار پورے چاند کی رات تھی اور اس لیے چاند کی روشنی میں ہمارے لیے ایک خصوصی عشائیے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ چاند کی روشنی میں عشائیے کا اہتمام شمالی کرناٹک کے لیے اہلِ خانہ کے اکٹھا ہونے کا پسندیدہ موقع ہوتا ہے۔ ہم لوگ دن کا کام جلدی جلدی ختم کر ہی رہے تھے کہ میں نے سنا کہ کوئی مجھے آواز دے رہا ہے۔

''کلکرنی! کیا آپ میرے دفتر میں آسکتی ہیں؟''

میرا دل ڈوب گیا۔ یہ میرے آجر تھے جو میرے شادی سے پہلے کے نام سے مجھے بلا رہے تھے اور ان کے لہجے کو دیکھتے ہوئے لگتا تھا کہ معاملہ فوری توجہ کا متقاضی تھا۔ حالانکہ میں آفس سے باہر نکل رہی تھی لیکن میں رک گئی، یہ پتا لگانے کے لیے کہ وہ کیا چاہتے تھے۔

''معاف کرنا تمھیں پریشان کررہا ہوں لیکن تمھیں ایک ضروری کام کرنا ہے۔'' ایک خط پڑھنے کے لیے میرے حوالے کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ آئندہ دو دنوں کے اندر اندر مجھے ایک پروجیکٹ کے جائے وقوع کو دیکھنے جانا تھا۔

''بالکل کوئی مسئلہ نہیں، حضور والا، میں کروں گی۔'' میں نے کہا۔ میں پورے دن اور پورے ہفتے کام کرنے کی عادی ہوچکی تھی۔ اس لیے اپنے سفر کے منصوبے کو رد کرنے سے مجھے قطعاً کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ مجھے کسی جشن یا گھر کے باہر تفریحی پروگرام کے مقابلے میں اپنے کام سے زیادہ خوشی میسر ہوتی تھی۔

اگلی صبح، میں اس قصبے کے لیے روانہ ہوگئی جہاں یہ پروجیکٹ واقع تھا۔ جس وقت میں قصبے میں پہنچی، دوپہر ہوچکی تھی، لیکن ایسا لگا کہ جیسے دن ابھی شروع ہوا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ دکانیں ابھی کھل رہی تھیں اور عوام الناس اپنے اپنے کام پر جارہے تھے۔

بس اسٹینڈ سے میں پیدل چل رہی تھی کہ ایک نوجوان لڑکا میری طرف جلدی سے بڑھا اور کہا، ''معاف کیجیے گا مادام مجھ سے تاخیر ہوگئی۔ مجھے بس اسٹاپ پر ہی آپ کا استقبال کرنا چاہیے تھا۔'' وہ ہمارے گاہک کا نمائندہ تھا اور مجھے اپنے دفتر لے جانے کے لیے آیا تھا۔

کچھ منٹ پیدل چلنے کے بعد ہم دفتر پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا سا آفس تھا۔ حالانکہ کسی بھی طرح سے ماڈرن نہیں تھا لیکن یہ کچھ پرانے تاہم مرمّت کیے ہوئے فرنیچر سے باقاعدگی کے ساتھ آراستہ تھا۔ ہر چیز اپنی صحیح جگہ پر رکھی تھی۔ دفتر کے سبھی لوگ میرا انتظار کررہے تھے اور وہاں بیٹھتے ہوئے مجھے بڑا بھلا لگا۔ ٹھنڈی لسّی جو ان لوگوں نے مجھے پیش کی تھی، فرحت بخش تھی۔

قبل اس کے کہ میں اپنا کام شروع کروں، میرا تعارف صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان سے کرایا گیا جسے میرے ساتھ کام کرنا تھا۔ وہ بہت خوش اخلاق، پُراعتماد اور ذہین لگا۔ اس کے معیاری کام کو دیکھ کر مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ اس کے کام میں پیشہ ورانہ مہارت کا احساس ہوتا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ اس قصبے میں وہ سب سے زیادہ وسیع المطالعہ آدمی تھا۔

اس نے اپنے کام کا منصوبہ بڑی مہارت سے تیار کیا تھا جس کی وجہ سے ہمارا کام توقع کے برخلاف جلدی ختم ہوگیا۔ جب میں اسے الوداع کہنے والی تھی تو اس کی تعریف کرنا نہیں بھولی۔ میری تعریف پر وہ خوشی سے کھل اٹھا اور اس نے زور دیا کہ میں نزدیک ہی اس کے گھر پر اس کے ساتھ چائے نوش کروں۔

اس کا گھر بھی اچھی حالت میں تھا۔ چائے کے وقت تک اس کی گفتگو ذاتی رنگ اختیار کرچکی تھی۔ اس نے اپنے والدین اور اپنی شروع کی نوکری

● ''عکس اور برعکس'' سُدھا مورتی کی 52کہانیوں کا مجموعہ ہے جو ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ مصنفہ نے ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کیا ہے اور تقریباً ایک ہزار گاؤں کے لوگوں کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔ یہ کہانیاں ان کے اسی مشاہدے کی دین ہیں۔ مصنفہ نے صرف نام بدل دیے ہیں، کہانیوں کا ماحول اور کردار دونوں حقیقی ہیں۔ یہ کہانیاں بارہ مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوچکی ہیں۔ 230 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 128 روپیے ہے۔ کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو چالیس فیصد رعایت دیتی ہے۔

کے بارے میں بات چیت کی۔ اس نے اپنی شریک حیات اور دو سال کے بیٹے کا تعارف کرایا۔ اس نے اپنی بیوی کے اسکول کے دنوں کی کامیابیوں، اس کی دل کش آواز اور کھانا پکانے کی مہارت کے لیے تعریفی انداز میں بات کی۔ اس کے بعد اس نے اپنے بیٹے کو بلایا جو فوراً اندر آیا اور اپنی بانہوں کو سینے پر باندھ کر میرے بازو میں ایسے کھڑا ہوگیا جیسے اسی طرح کی تربیت دی گئی ہو۔ جوں ہی اس کے باپ نے اس سے نظم سنانے کے لیے کہا اس نے اپنی صاف اور ہکلائی آواز میں سنانا شروع کردیا۔ میں نے اپنا سر ہلا کر اس کی نظم سرائی کا اعتراف کیا۔ باپ اپنے بیٹے کی صلاحیت کے برائے نام اعتراف سے مطمئن نہیں لگا۔ اس نے دیوار سے لٹک رہے پرانے جدول سے تمام حروف تہجی کو پہچاننے کے لیے بچے سے کہا۔ یہی چیزیں ہیں جنھیں کرنا بچے عام طور پر سخت ناپسند کرتے ہیں پھر بھی والدین انھیں مجبور کرتے رہتے ہیں۔ لاچار، بے بس بیچارے بچے!

میرے میزبان کے گھر میں یہ مظاہرہ تقریباً آدھے گھنٹے تک چلتا رہا یہاں تک کہ بچہ بے چینی اور چڑچڑاہٹ کے آثار ظاہر کرنے لگا۔ ماں ہوشیاری سے بچے کو شاید چوکلیٹ یا بسکٹ بطور انعام دینے کے لیے باورچی خانے کی طرف لے گئی۔

میں نے محسوس کیا کہ باپ اپنے بچے کے بارے میں مجھ سے کچھ اور تعریف سننے کی توقع کررہا تھا۔ ''آپ کا بچہ اپنی عمر کے اعتبار سے کافی ذہین ہے۔'' میں نے کہا۔

''بیشک! میں نے اس کی تربیت بچپن ہی سے اس نہج کی کی ہے۔'' اس نے فخر یہ کہا۔ ایسا لگا کہ اس نے اپنے دو سال کے بچے کی تربیت اس کے یوم پیدائش سے ہی شروع کردی تھی!

''کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ صرف تربیت ہی سے بچے ذہین ہوسکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''قطعی نہیں۔ موروثی خصوصیات اور Genes بھی اہم رول ادا کرتی ہیں۔ میرا بیٹا مجھ سے مشابہ ہے۔'' اس آدمی کا چہرہ فخر سے چمک اٹھا اور میں مزید سننے کے لیے خواہش مند تھی کیوں کہ میری بس چھوٹنے میں ایک گھنٹے کا وقت تھا۔

''آپ اپنے کالج کے دنوں میں یقیناً اچھے طالب علم رہے ہوں گے؟'' میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں، میں تھا۔ میں نے اپنے اسکول اور کالج کے دنوں میں ہمیشہ پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ظاہری بات ہے۔'' اس میں اس کی تعریف مضمر تھی۔

''آپ نے ڈگری کہاں سے حاصل کی؟'' میں مزید سننے کی خواہش مند تھی۔

''میں نے بی وی بی انجینئرنگ کالج، ہوبلی سے ڈگری حاصل کی۔''

میں چونکی۔ میں ہوبلی کو جانتی تھی۔ کالج کو جانتی تھی۔

''کس سال؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلی پوزیشن کے ساتھ میں نے 1972 میں ڈگری حاصل کی۔''

''کیا آپ نے سونے کا تمغہ بھی حاصل کیا؟'' میں ڈٹی رہی۔

''ہاں، میں نے اس سال کا سونے کا تمغہ بھی حاصل کیا۔'' خود اعتمادی سے تمتماتے ہوئے اس نے کہا۔

اب میں اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں تھی، اور جو میں نے دیکھا اس سے میں دکھی ہوئی۔

''کیا میں آپ کے سونے کا تمغہ دیکھ سکتی ہوں؟'' میں نے گزارش کی۔

اچانک کمرے کا ماحول بدل گیا۔ ''کیوں؟ کیا مجھ پر بھروسہ نہیں؟'' اس کی آواز غیر یقینی تھی۔

''نہیں، میں صرف اس سونے کے تمغے کو دیکھنا چاہتی ہوں جسے آپ نے 1972 میں حاصل کیا تھا'' میں نے دہرایا۔

''یہ میرے لیے نہایت بیش قیمت ہے اور اس لیے میں نے اسے بینک لاکر میں رکھ دیا ہے۔'' اس نے کہا۔

میں نے ہار نہیں مانی۔ ''کس بینک میں؟''

''یہ ساری تفصیل میں آپ کو کیوں دوں؟'' اس نے مطالبہ کیا، میرے اصرار سے وہ پریشان تھا۔

اب ساری چیزیں واضح ہوچکی تھیں۔ میں سمجھتی ہوں یہ اس پر بھی واضح ہوچکا تھا۔ میزبانی کا جوش و خروش ختم ہوچکا تھا۔ میری بس کا وقت ہوچکا تھا اور میرے جانے کا بھی وقت ہوچکا تھا۔

دروازے کی طرف چلتے وقت میں نے اس سے کہا۔ ''مجھے آپ کے بینک یا سونے کے تمغے کے بارے میں کسی تفصیل کو نہیں جاننا ہے۔ یہ میرا کام نہیں ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تمغہ آپ کے پاس نہیں ہوسکتا۔''

''آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں؟ اور وہ بھی اتنی خود اعتمادی کے ساتھ؟'' وہ اب بالکل ناراض تھا۔

''کیوں کہ'' میں نے اس سے دکھی ہوکر کہا، ''1972 میں اس سونے کے تمغے کو میں نے حاصل کیا تھا اور ہر سال صرف ایک سونے کا تمغہ بطور انعام دیا جاتا ہے۔''

اس انکشاف سے وہ دم بخود رہ گیا اور خالی خالی آنکھوں سے مجھے گھورتا رہا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور ملائمت سے کہا ''تم ذہین ہو۔ تم اپنے کام میں اچھے ہو۔ تم جھوٹ کیوں بولتے ہو؟ اس سے تمھیں کیا ملتا ہے؟''

میرے پیچھے صدر دروازے کے بند ہونے کی آواز ہی واحد جواب تھا جو مجھے ملا۔

مصنف: سید جعفر محمود
مترجم: سید مرغوب احمد

## ہماری مطبوعات

"آزادی کے بعد سے سائنس ٹیکنالوجی اور ترقی" سے اقتباس

# لیزر

لیزر کو بہت سے لوگ اسٹریٹجک ڈیفنس انسٹیٹیوٹ (Stratigic Defence Initiative) یا SDF سے منسلک سمجھتے ہیں جسے عرف عام میں اسٹاروارس (Star Wars) سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ مگر ہندوستان میں ان کا استعمال پرامن مقاصد کے لیے بہت زیادہ کیا جارہا ہے۔

لیزر شعاعیں، روشنی کی مربوط (coherent) شعاعیں ہوتی ہیں۔ یہ شعاعیں اتنی شدت اور زور والی ہوتی ہیں کہ یہ دنیا میں پائے جانے والے سب سے سخت مادے کو بھی بخارات میں تبدیل کرسکتی ہیں۔ ان کا استعمال ہیروں میں سوراخ کرنے، آنکھ سے جدا کیے جانے والے ریٹنا (Ratina) کو ویلڈ کرنے اور دماغ یا نخاعی ڈور (spiral cord) کی گہرائیوں میں واقع نقصان دہ دماغی ٹیومروں کو تباہ کرنے میں کیا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ ان سے پیغام رسانی کا کام بھی لیا جارہا ہے۔

ملک میں 90فیصد سے زیادہ ایسے ریسرچ ادارے، یونیورسٹیاں اور چند ایک پرائیویٹ کمپنیاں لیزر سے متعلق مختلف پہلوؤں پر کام کررہی ہیں، جیسے انھیں بنانا، لیزر مادوں کا فروغ اور مختلف میدانوں جیسے موسمیات، پیغام رسانی، ادویہ اور ہم جاعلیحدگی (separation) اور ابتدائی تحقیق میں ان کا استعمال۔

اس ملک میں لیزر کی تیاری کا کام کئی اداروں میں چل رہا ہے اور انھوں نے کامیابی سے نائٹروجن، کاربن ڈائی آکسائڈ اور ہیلیم نی آن لیزر بھی تیار کرلی ہیں۔ سائنس دانوں کو یقین ہے کہ ملک میں تجارتی طور پر تیار ہونے والے نائٹروجن، آرگن، ہیلیم، کیڈمیم اور نائٹروجن پمپڈ ڈائی (Nitrogen pumped dye) لیزر (تمام کی تمام سینٹرل الیکٹرانک لمیٹڈ، صاحب آباد کے ذریعے)، اڈوانی آرلکن اینڈ جانچی لمیٹڈ کے ذریعے تیار شدہ کاربن ڈائی آکسائڈ لیزر، الیکٹرانکس کارپوریشن آف انڈیا لمیٹڈ کے ذریعے ہیلیم، نی آن لیزر کو جلد ہی مقبولیت اور اعتماد حاصل ہوجائے گا۔

اس ملک میں لیزر کو فروغ دینے کی کوششیں بہت پہلے یعنی 1946 سے ہی شروع ہوگئی تھیں۔ پہلی دہائی میں تو اس مشغلے میں سرگرمی پیدا نہ ہوپائی البتہ 1970 کی وسطی دہائی سے اس مشغلے میں شدت پیدا ہوتی چلی گئی۔ حالانکہ اگر دیگر ترقی یافتہ ممالک سے مقابلہ کیا جائے تو اس ضمن میں کی جانے والی تمام کاوشوں کو معمولی ہی قرار دیا جاسکتا ہے مگر پھر بہت سے اداروں اور ریسرچ تنظیموں نے اس سے متعلق کافی معلومات اکٹھی کرلی ہیں اور یہ ادارے اور تنظیمیں لیزر کی تیاری اور ان کی فروخت کے سلسلے میں ذاتی طور پر تحقیق و فروغ (R&D) میں لگی ہوئی ہیں۔

ابتدائی آرگن لیزر تو آئی آئی ٹی کانپور نے تیار کی تھی اور بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی نے فوٹو کیمسٹری پر کام کرنے کے لیے پلس کاربن ڈائی آکسائڈ (Pulse Carbondioxide) لیزر تیار کی ہے۔

اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے لیزر کا استعمال مختلف میدانوں میں کیا جارہا ہے، ذیل میں ان کے کچھ اہم استعمال کا ذکر کیا گیا ہے۔

شدید اور باریک خطی چوڑائی والی شعاع بنائی جاسکنے کے سبب لیزر نے اسپیکٹرواسکوپی (spectroscopy) کے میدان میں ایک انقلاب برپا کردیا ہے۔ انجذابی طیف (absorption spectrum) کی پیمائش میں یہ کمزور انجذابی خطوط (weak absorption lines) کا پتہ چلانے میں بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہیں، کمزور انجذابی طیفوں (weak absorption spectra) کا پتہ چلانے کے لیے کئی تکنیکیں اختیار کی جاتی ہیں جیسے آپٹواکاسٹک اسپیکٹرواسکوپی (spectro scopy optoacaustic) ملٹی فوٹان آئیونائزیشن اسپیکٹرواسکوپی (multiphoton ionisation spectroscopy) وغیرہ۔ غیرخطی اسپیکٹرواسکوپک تکنیکیں بھی ہیں جیسے ٹو پی فوٹان ایبزارپشن اسپیکٹرواسکوپی (two photon absorption spectroscopy) لیزر کی وجہ سے ہی رمن اسپیکٹرم ریکارڈ کرنے میں لگنے والا وقت گھنٹوں کے بجائے اب منٹوں میں تبدیل ہوگیا ہے۔ رمن اسپیکٹرم

● ہندوستان نے آزادی کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں قابلِ لحاظ پیش رفت کی ہے۔ اس کتاب میں جوہری توانائی، خلائی سائنس اور زراعت کے میدان میں حاصل شدہ کامیابیوں کے علاوہ بایوٹیکنالوجی، دفاع، لیزرس، الیکٹرانکس، ٹیلی کمیونکیشن اور رسمی توانائی کے شعبوں میں انجام دیے جانے والے کام کی تفصیل بھی موجود ہے۔ عام قارئین اور طلبہ کے لیے یکساں طور پر مفید 487صفحات کی اس کتاب کی قیمت 123 روپیے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر اساتذہ اور طلبہ کو چالیس فیصد رعایت دیتی ہے۔

میں اب زیادہ تر آرگن آئن لیزر استعمال کی جاتی ہے۔

کیمیا میں لیزر دونوں طرح سے یعنی تشخیصی انداز میں اور کیمیاوی تعاملات کو جاری کرنے میں استعمال کی جاتی ہیں۔ اس سے کسی عنصر کے ہم جا (isotopes) علیحدہ کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ کیمیاوی طور پر استعمال کی جانے والی عام لیزر ہیں: ڈائی لیزر (dye laser) کاربن ڈائی آکسائڈ لیزر اور Nd:YAG۔

انڈسٹری لیزر صنعتوں میں بہت زیادہ استعمال کی جارہی ہیں۔ آج کل معمول کے طور پر لیزر کا استعمال دھاتی پروسیسنگ، ویلڈنگ، کٹنگ، گیزنگ (gazing)، ایلائنگ کلیڈنگ (alloying cladding)، غیر تخریبی آزمائش (nondestructive testing) وغیرہ کے دوران نگرانی کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس کا استعمال ڈھانچوں—پل، بڑی بڑی عمارتیں، سرنگیں، پائپ، کان وغیرہ کو سیدھا بنانے میں بھی کیا جاتا ہے۔ لیزر نے سوراخ کرنے کی مروجہ تکنیکوں کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب ہیرے، جواہرات، جیٹ انجنوں کے ٹربائن بلیڈس (trubine blades) میں لیزر سے ہی سوراخ کیے جاتے ہیں۔ دھات، ترابیات (ceramics)، پلاسٹکس، کارڈ بورڈ (گتا) کپڑے وغیرہ کاٹنے میں اب زیادہ تر لیزر ہی استعمال کی جاتی ہیں۔

شمسی سیلوں کو لیزر سے کمانے (annealing) کی وجہ سے ان کی کارکردگی میں اضافہ ہوگیا ہے۔ سلکن کی ورقیوں (silicon wapers) پر بلاواسطہ طور پر لکھنے کے لیے لیزر کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ICS کے لیے ان نقشوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

آج کل لیزر کا استعمال پلاسٹک، دھات کی چیزوں وغیرہ پر لکھنے کے لیے بہت زیادہ کیا جارہا ہے، لیزر اسکینروں (Laser scanners) سے دکانوں میں رکھی صارفین سے متعلقہ چیزوں پر بارکوڈس (bar codes) کو پڑھنے میں مدد لی جاتی ہے اس کے علاوہ ان کی مدد سے ورکشاپ میں حساس آلات کا معائنہ کرنے کا کام، چلتی ہوئی ٹرین میں سامان کی ویگنوں کو تلاش کر لینے، کتاب اور دیگر دستاویزات پڑھنے کا کام بھی لیا جاسکتا ہے۔ سطحوں کے حرارتی عمل (heat treatment) کے لیے بھی لیزر ہی استعمال کی جاتی ہیں۔

جدید جنگ وجدل میں ہتھیار نظامات میں لیزر کا بہت استعمال کیا جاتا ہے، ان کی مدد سے ٹینکوں اور آرٹلری گن کا پتہ چلا لیا جاتا ہے، ہدف کا فاصلہ بالکل صحیح صحیح ناپ لیا جاتا ہے اور اس طرح انھیں پہلی ہی مرتبہ میں نشانہ بنا لینے کی اہلیت بڑھ جاتی ہے۔

Ye-Ne لیزر سے رائفل سے نکلنے والی گولی کی نقل اتاری جاسکتی ہے۔ اس طرح سپاہیوں کو ٹریننگ کے دوران اس کے بارے میں اچھی طرح بتانے اور بندوق کا نشانہ بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔

لیزر آئسوٹوپک سیپریشن (Laser isotopic separation یا LIS) سے قدرتی یورینیم کو کفایتی انداز میں مقوی بنانے (enriching) کی توقعات پیدا ہوگئی ہیں۔

گداخت پاور (fusion power) کو مفید کرنے کے قائم رہ سکنے والے طریقے کی کھوج بین کرنے میں بھی یہ اہم کردار ادا کررہی ہیں۔

طب کے تمام شعبوں میں لیزر استعمال کی جارہی ہیں۔ اعلیٰ پاور والی بے حد شدید لیزر شعاعیں بافت (tissue) کاٹنے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ اس طرح یہ ایک زبردست آلۂ جراحی ثابت ہوسکتی ہیں اور مروجہ نشتر (scalpel) کا مقام لے سکتی ہیں اس کے فائدے یہ ہیں، (i) جریان خون کو روکتی ہیں۔ (ii) انفیکشن ہونے کے امکانات بہت کم ہوجاتے ہیں۔ (iii) قریبی خلیوں کو بہت کم نقصان پہنچاتی ہیں۔

کورائڈ (chorold) سے الگ کیے گئے ریٹنا (ratina) کو عام طور پر لیزر سے ہی ویلڈ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آنکھ کی دیگر خطرناک حالتوں میں انھی سے علاج کیا جاتا ہے جیسے ڈائی بیٹک رہونوپوتھی (diabatic rehonoputhty)، میکولر ڈی جنریشن (macular degeneration) اور ہیمرج (haemorrhage)۔ ان بیماریوں کا علاج کرنے کے لیے آرگن یا کرپٹن آئن لیزر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ کالا موتیا (Glucoma) آنکھ کی ایسی بیماری ہے کہ جس میں آنکھ کے ڈھیلے کے اندر پریشر (دباؤ) بڑھ جاتا ہے اور نتیجہ نکلتا ہے کہ ریٹنا تباہ ہوجاتا ہے اور آدمی مکمل طور پر اندھا ہوجاتا ہے۔ اس پریشر پر قابو پانے اور بصارت کو بچانے کے لیے آنکھ میں Nd-Yag لیزر سے ایک چھوٹا سا سوراخ کردیا جاتا ہے۔ لیزر کا استعمال آنکھ کے عدسہ کی بناوٹ کو درست کرنے کے لیے بھی کیا جاتا ہے مثال کے طور پر مایوپیا (myopia) میں عدسہ کی بناوٹ کو درست کرنے کے لیے، جس طریقہ کار کا استعمال کیا جاتا ہے اسے ریڈیلی کیریٹوٹومی (radial kereto tomy) کہا جاتا ہے۔

نازک آپریشنوں جیسے ہارٹ بائی پاس سرجری اور نیوروسرجیکل انٹروینشن (neuro surgical intervention) میں لیزر سرجری کی صحت وصداقت کو ایک بڑا فائدہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ فائبر آپٹک اینڈواسکوپ (fibre optic endoscope) کو لیزر کے ہمراہ استعمال کرکے اب یہ بات ممکن ہوگئی ہے کہ جسم کے کسی بھی حصے کو کھولے بغیر خون رستے ہوئے السر کو جلایا جاسکے۔ دل کو خون لے جانے والی شریانوں میں جب رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے تو اس کے

نتیجے میں مائیوکارڈیل انفکشن (myocardial infection) پیدا ہوجاتا ہے۔ اس کا علاج بھی لیزر سے ہی کیا جاتا ہے۔ اب تک اس کا علاج یہ ہے کہ جسم کے کسی اور حصے کی کسی شریان سے بند شریان کو شنٹ (shunt) کردیا جاتا ہے۔ اس طریقہ کار کو ہی بائی پاس سرجری سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کینسر کا علاج کرنے میں فوٹو اشعاع ریزی تھریپی (Photo radiation therapy) کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ہیمٹو، پروفائرین ڈیریوٹیو (Hemato prophyrin derivative) ایک ایسی ڈائی ہے جس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ خاص طور پر کینسر کے خلیوں پر حملہ آور ہوتی ہے۔ جب گولڈ ویپر لیزر (gold vapour laser) سے شدید قسم کی لیزر شعاعوں کی اشعاع ریزی کی جاتی ہے تو Hpd سالمہ تحلیل ہوجاتا ہے اور اس سے ایک آکسیجن ایٹم خارج ہوتا ہے جو کینسر کے خلیوں اور بافت کو ختم کردیتا ہے۔

گردہ اور پتے کی پتھری کے علاج میں بھی اثر آفریں طور پر لیزر استعمال کی جارہی ہیں۔

روشنی کے ذریعے کی جانے والی تمام پیغام رسانی میں سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ یہ موسمی حالات کا اثر قبول کرلیتی تھی۔ 1974 میں کارننگ (Corning) نے بہت زیادہ خالص مادوں سے کمتر زیاں والا آپٹیکل فائبر (low loss optical fibre) تیار کیا۔ اب آپٹیکل فائبر اور نیم موصلی لیزر دونوں کی تکنیکوں میں قابل قدر ترقی ہوچکی ہے۔ آپٹیکل فائبرس کا زیاں، 1.5 مائکرون طول موج پر 0.3db/km (یعنی 10 کلومیٹر طویل فائبر سے واقع روشنی (incident light) کے 50% حصے کی ترسیل ہوجائے گی) سے بھی کم ہوجاتا ہے۔

اعداد وشمار کی ترسیل کے علاوہ آپٹیکل انفارمیشن پروسیسنگ (optical information processing) اور آپٹیکل کمپیوٹرس ایک دوسرے سے متعلقہ معاملات ہیں۔ آپٹیکل انفارمیشن پروسیسنگ کا استعمال فنگر پرنٹس کو پہچاننے، سیٹلائٹوں اور بہت اونچائی پر اڑنے والے ہوائی جہازوں سے کھینچی جانے والی تصویروں کی پروسیسنگ میں کیا جاتا ہے۔ آپٹیکل بائی اسٹیبل (optical bistable) ترکیب پر منحصر، آپٹیکل کمپیوٹروں سے تحسیب کرنے کی رفتار اور اسی کے ساتھ ساتھ متوازی تحسیب کرنے کی اہلیت میں کئی گنا اضافہ ہوجائے گا۔

اعداد وشمار کو محفوظ رکھنے والا ایک دوسرا علاقہ ایسا ہے کہ جہاں آپٹیکل طریقوں کو اختیار کرنے سے اعداد وشمار محفوظ رکھنے کی کثافت میں امکانی طور پر اضافہ ہوسکتا ہے۔ ذخیرہ واسطہ (storage medium) عام طور پر دھات کی ایک باریک فلم ہوتی ہے جس کی مناظری خصوصیت (optical property) جیسے کہ انعکاس (reflectivity) کو طاقتور "WRITE" لیزر سے منور کرکے مزید بہتر بنالیا جاتا ہے۔ کم پاور والی READ لیزر آپٹیکل خصوصیت میں واقع تبدیلی کو پڑھ لیتی ہے اور اس طرح مطلوبہ معلومات حاصل ہوجاتی ہیں۔ معلومات کے ایک حصے کو رکارڈ کرنے کے لیے اسے ایک مربع مائکرون سے بھی کم جگہ درکار ہوتی ہے۔ آج کل تفریحی سامان میں زیادہ تر لیزر ڈسک استعمال کی جاتی ہے۔ حالانکہ لیزر آپٹیکل اعداد وشمار ذخیرہ کرنے والی ڈسک میں مقناطیسی ڈسک کے مقابلے اعداد وشمار ذخیرہ کرنے کی گنجائش بہت زیادہ ہوتی ہے مگر دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ اس میں ذخیرہ شدہ معلومات کو صاف نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کامپیکٹ ڈسک (CD) ذخیرہ شدہ معلومات کو پڑھنے کے لیے سوئی کے بجائے لیزر شعاعوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے ڈسک کے نشانات (grooves) بہت ہی چھوٹے چھوٹے بنائے جاسکتے ہیں (ایک میٹر کے دس لاکھویں حصے تک بھی)۔ بے انتہا معلومات ذخیرہ ہوجانے کے سبب غیر معمولی وفاداری (fidelity) حاصل ہوجاتی ہے۔ نیم موصلی لیزر CD پر روشنی ڈالتی ہے اور اس سے نکلنے والی روشنی کو الیکٹرانی طور پر پروسیسنگ کے ذریعے پڑھ لیتی ہے۔ CD ROMS (صرف Memories) (یادداشتیں) ہی پڑھتی ہے) سے ہم پوری پوری انسائیکلوپیڈیا کو صرف ایک ڈسک پر ذخیرہ کرسکتے ہیں۔ مروجہ کمپیوٹر میں یادداشت ذخیرہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے مقناطیسی طور پر رکارڈ کرلیا جاتا ہے پھر حسب ضرورت اسے پڑھ لیا جاتا ہے۔ مگر آپٹیکل ڈسک کا فائدہ یہ ہے کہ ایک تو اس میں زیادہ معلومات زیادہ عرصے تک رکارڈ رکھی جاسکتی ہے، دوم یہ کہ وقت ضرورت بہت کم عرصے میں اسے دوبارہ حاصل کیا جاسکتا ہے (پڑھا جاسکتا ہے)۔

ہندوستان میں بہت پہلے یعنی ساٹھ کی دہائی کے وسط میں ہی سائنسی برادری اور مختلف اداروں نے لیزر کی اہمیت کا اندازہ لگالیا تھا۔ 1964 میں BARC نے پہلی مرتبہ گیلیم آرسینائڈ نیم موصلی لیزر تیار کرلی تھی۔ 1965-66 میں BARC اور TIFR کے درمیان آپٹیکل ترسیلی رابطہ قائم کرنے کے لیے لیزر کا استعمال کیا گیا۔ ہندوستان میں BARC کی تجربہ گاہ نے لیزر ٹیکنالوجی فروغ دینے کے ضمن میں سب سے زیادہ کوششیں کی ہیں۔ BARC نے رمن اسپیکٹرڈ سکوپی کے لیے 50MW کی لیزر فروغ دی ہے۔ اس نے مختلف $CO_2$ لیزر تیار کرنے کی سمت میں بھی کام کیا ہے۔ BARC نے سالڈ اسٹیٹ لیزر یعنی Nd:Yag لعل لیزر، Na گلاس لیزر بھی فروغ دی ہیں۔ دی سینٹر فار ایڈوانسڈ ٹیکنالوجی (The Centre for Advanced Technology یا CAT) نے لیزر فروغ دینے اور لیزر انجینئرنگ کا ایک

زبردست پروگرام چلانے کا منصوبہ تیار کیا ہے۔ اس کا ارادہ یہ بھی ہے کہ یہ محدود پیمانے پر لیزر اور لیزر سے متعلقہ آلات تیار کرے۔ CAT نے 10W CVL کی تیاری کا کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔

DRDO نے ٹینکوں کے لیے لیزر رینج فائنڈرس (laser range finders) فروغ دیے ہیں جن میں سوئچڈ Nd: glass لیزر استعمال کی جاتی ہے۔ DRDO لیزر سامان اور نیم موصلی لیزر کی فروغ دے رہی ہے۔ اس کے پاس مختلف تکنیکوں کے قلم (Crystals) تیار کرنے کی سہولیات بھی موجود ہیں اور اسے Nd:Yag قلم اور Ca As قلم تیار کرنے میں کامیابی حاصل ہو چکی ہے۔

مختلف آئی آئی ٹی خصوصاً کانپور اور مدراس لیزر فروغ دینے کے میدان میں کام کر رہی ہیں۔ ایسے ہی اداروں میں NPL اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کی کھوج بین اساس اچھی ہے مگر پالیسی کی حالیہ پیش قدمی سے پہلے تک لیزر کے سلسلے میں کی جانے والی کھوج بین سے تکنیکی اور تجارتی طور پر مناسب استفادہ نہیں کیا گیا۔ اس حالت میں اصلاح کرنے کے لیے کچھ کوششیں کی گئی ہیں اور نیشنل لیزر پروگرام کے ذریعے کچھ فارمولے وضع کیے گئے ہیں۔ یہ نیشنل لیزر پروگرام آٹھویں منصوبے کے تحت ڈپارٹمنٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، اٹامک انرجی اینڈ الیکٹرانکس کی مشترکہ حکمت عملی ہے۔ نیشنل لیزر پروگرام کا مقصد مختلف طرح سے استعمال کرنے کے لیے لیزر کو فروغ دینا اور انھیں بڑے پیمانے پر تیار کرنا ہے۔ اس پروگرام کے تحت عنقریب لیزر اور لیزر مبنی آلات کو کہیں کم قیمت پر ملک میں ہی تیار کیا جانے لگے گا جو اہم لیزر آلات، لیزر پیدا کرنے والے قلموں (crystals) اور متعلقہ آلات کا بدل ثابت ہوں گے۔ انا یونیورسٹی، مدراس کا ”دی کرسٹل گروتھ سینٹر (The crystal growth centre) کو لیزر پیدا کرنے والے قلم تیار کرنے کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے۔

دی سینٹرل سائنٹفک انسٹرومینٹس آرگنائزیشن (The Central Scientific Instruments Organisation) یا CSIO چودہ برس سے ہولوگرافک ٹیکنالوجی (holographic technology) پر کام کر رہی ہے۔ اس نے مختلف انداز میں کام آنے والے طرح طرح کے ہولوگرام (hologams) تیار کیے ہیں۔

ہولوگرافک ٹیکنالوجی ایک ایسی سائنس ہے کہ جس سے سہ ابعادی یا سہ جہتی (three dimensional) ایسی شبیہیں تیار کی جاتی ہیں جو اصل شے کا مکمل بدل قرار دی جا سکتی ہیں۔ مروجہ فوٹوگرافکس کے برعکس لیزر لائٹ کی مدد سے تیار کیا جانے والا ہولوگرام بھروسہ مند اور اصل شے کا سہ ابعادی مکمل کارڈ ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بظاہر تو شیشہ کا ایک ٹکڑا ہی نظر آتا ہے مگر جب شبیہہ پر روشنی پڑتی ہے تو نگاہوں کے سامنے اصل شے کی ہو بہو نقل بن جاتی ہے۔ اس ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانے والوں میں خاص طور پر جوہریوں، نادر اشیا تیار کرنے والوں، عجائب گھروں کی حفاظت کرنے اور مشتہر کرنے والی ایجنسیوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جوہریوں کو جواہرات سے مزین اصل شے کو دکان کی الماریوں میں سجانے اور چوری کا خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ان کے بدلے میں ان کے ہولوگرام سے کام چلا سکتے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی بہبود اور ترقی کے لیے ابھی ہندوستان کو لیزر کے استعمال میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔

□□□


**ہندستان کا صنعتی ارتقا**

**مصنف: ڈاکٹر ڈی آر گیڈگل، پروفیسر ایم صدیقی**

ہندستان کی تاریخ میں 1857 ایک اہم سنگ میل ہے۔ اس سال نہ صرف ملک پر پوری طرح سے انگریز قابض ہو گئے بلکہ اسی کے بعد ہندستانیوں کی خود احتسابی کا دور بھی شروع ہوا جس کے نتیجے میں مختلف اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں اور ملک نشاۃ ثانیہ سے ہم کنار ہوا۔ 1857 کے بعد سے ہی صحیح معنوں میں ہندستان کی صنعتی ترقی بھی شروع ہوئی۔ اس کتاب میں 1860 سے 1939 تک ملک کے صنعتی ارتقا کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 343، قیمت: -/130 روپے

**صنعتی تنظیم اور انتظام**

**مصنف: محمد احترام اللہ**

آج کے صارفی سماج میں انتظامی شعبے کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ایک کامیاب منتظم حال پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف بی۔ کام کے طالب علموں کی ضرورت کو پورا کرتی ہے بلکہ علم دوست اردو قاری کو بھی جدید صنعتی شعبے اور معیشت کے دیگر رموز سے آگاہ کرتی ہے۔

صفحات: 606، قیمت: -/149 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

امیت جین، سمراٹ شرما، سوربھ بنرجی

"مائکروسافٹ پاور پوائنٹ" سے اقتباس

# پریزنٹیشن کو بہتر بنانا

## ویوئنگ یور پریزنٹیشن

سب سے اہم کام اپنے پریزنٹیشن پر نظر ڈالنا اور اسے دوسروں کو بھی دکھانا ہے۔ ویو مینو کے آپشن ویو کے اندر آپ اسے چیک کر سکتے ہیں۔ اپنے پریزنٹیشن پر نظر ڈالنے اور اسے چیک کرنے کا ویوئنگ یور پریزنٹیشن سب سے تیز رفتار اور آسان طریقہ ہے۔

## ویوئنگ کی قسمیں:

نارمل ویو (Normal View)، آؤٹ لائن ویو (Outline View)، سلائڈ ویو (Slide View)، سلائڈ سارٹر ویو (Slide Sorter View)

## نارمل ویو

جب آپ پاور پوائنٹ کھولتے ہیں تو ایک ڈیفالٹ (غیر متعین) ویو نظر آتا ہے۔ یہ ہر سلائڈ کی مکمل تصویر کشی کرتا ہے۔ آپ View Menu کے سلائڈ آپشن پر اسے چیک کر سکتے ہیں۔

## آؤٹ لائن ویو

اگر آپ چاہتے ہیں کہ کسی طرح ہر ایک سلائڈ میں لکھے ہوئے پورے ٹیکسٹ پر آپ کی نظر پڑ جائے تو آؤٹ لائن ویو ہی اس کا حل ہے۔ ہر سلائڈ یکے بعد دیگرے لسٹ کی شکل میں نمودار ہوگا۔ اگر کوئی امیج یا گرافکس نہ ہو تو سلائڈ آئیکن بالکل خالی نظر آئے گا اور اگر ایسا نہیں تو گرافک ریپریزنٹیشن کی ایک چھوٹی سی علامت نظر آئے گی۔

اسکرین پر ایک چلتا ہوا ٹائٹل والا ونڈو کلر دکھائی دے گا۔ ویو مینو سے آپ سلائڈ منی ایچر آپشن کو سلیکٹ کر سکتے ہیں اگر یہ ونڈو متحرک نہیں ہوتا۔ یہاں آپ ویو مینو سے آؤٹ آپشن کو سلیکٹ کر سکتے ہیں۔

## سلائڈ ویو

سلائڈ ویو بھی نارمل ویو کی طرح ہی ہوتے ہیں۔ مگر سلائڈوں کی تفصیل پوشیدہ ہوتی ہے اور صرف ان کا آئیکن دکھائی دیتا ہے۔ نیز نوٹس ونڈو اس ویو میں موجود نہیں ہوتا۔ درحقیقت اگر آپ سلائڈ اور آئیکنوں کے درمیان متعین (Seperate) بار کو ڈریگ کریں تو واپس نارمل ویو پر پہنچ جائیں گے۔ ویو مینو سے سلائڈ آپشن کو سلیکٹ کر کے اسے چیک کرنے کی کوشش کریں۔

## سلائڈ سارٹر ویو

یہ آپ کے بنائے ہوئے ہر سلائڈ کی ایک چھوٹی سی تصویر پیش کرتا ہے۔ نیز یہ ویو آپ کو وہ شکل بھی دکھائے گا جس میں ہر ایک سلائڈ بالترتیب رکھا گیا ہو۔ ایک سلائڈ کے اوپر دوسرا سلائڈ کھینچنے میں بھی یہ آپ کی مدد کرے گا۔ لہٰذا آگے بڑھیے۔ انھیں کسی بھی آرڈر میں رکھیے اور پھر فائنل مرحلے میں سلائڈ سارٹروں کے ذریعے انھیں ترتیب دیجیے۔ سلائڈ کا نمبر ہر سلائڈ کے نیچے سیدھے کارنر پر دکھائی دے گا۔ ہر سلائڈ کے ڈسپلے ہوتے وقت نظر رکھیے کیوں کہ پریزنٹیشن آؤٹ پٹ سلائڈ شو کی حیثیت رکھتا ہے۔ سلائڈ سارٹروں کو سلیکٹ کرنے کے لیے ایرو کیز کو سلائڈ کے اوپر رکھیے یا بائیں طرف اس پر کلک کیجیے۔ موٹے آؤٹ لائنوں کے ساتھ سلائڈ جلی شکل میں دکھائی دے گا۔ ایک سے زائد سلائڈوں کو سلیکٹ کرنے کے لیے شفٹ کی کو دبا کر رکھیے اور تمام سلائڈوں پر کلک کیجیے۔ اگر سلائڈوں میں سے کسی ایک سلائڈ کو ارینج کرنا چاہتے ہیں تو اسے کلک کیجیے اور ڈریگ کرتے ہوئے صحیح پوزیشن تک لائیے۔ کسی سلائڈ پر دوبارہ کلک کرنے سے اس سلائڈ کے ویو کو دوسرے سلائڈ و میں چینج کردے گا۔

## سلائڈ شو ویو

اس ویو سے آپ اپنے بنائے ہوئے پرزنٹیشن کو اسکرین پر دیکھ سکتے ہیں۔ ویو مینو سے سلائڈ شو آپشن کو سلیکٹ کیجیے اور اپنے سلائڈ شو کو دیکھ لیجیے۔ بس آپشن کو کلک کرتے رہیے اور دیکھتے رہیے۔

## ٹیکسٹ کے ارد گرد کھیلنا

ٹیکسٹ کی مقدار یا سائز چاہے جو بھی ہو وہ ہمیشہ پرزنٹیشن کا ایک حتمی جزو ہوتا ہے۔ ابتدائی طور پر آپ ٹیکسٹ کو اپنے پریزنٹیشن کا عنوان سمجھتے ہیں

● نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کمیونیکیشن اینڈ انفارمیشن ریسورسیز سی۔ایس۔آئی۔آر یونٹ نے طلبہ اور عام شائقین میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے "سب کے لیے آئی ٹی سیریز" کے تحت ایسی کتابیں تیار کی ہیں جو انھیں کمپیوٹر سے متعلق بنیادی باتوں سے روشناس کراتی ہیں۔ قارئین "اردو دنیا" کے لیے اس سیریز کی کتاب "مائکروسافٹ پاور پوائنٹ" سے اقتباس پیش ہے۔

لیکن بعد میں مختلف ٹیکسٹ باکسوں کے تحت آپ کے ڈاکومنٹ کا سائز بڑھتا جاتا ہے۔

## ٹیکسٹ کو ایڈٹ اور فارمیٹ کرنا

ڈیفالٹ لے آؤٹ کا ایک نقطے والا مستطیل باکس ہوتا ہے، نمونے کا ایک ٹیکسٹ بھی اس میں رہتا ہے جسے آپ اپنے مواد سے بدل سکتے ہیں۔ میٹیریل کو لکھنے کے بعد باکس کو ڈی سلیکٹ کرنے کے لیے باکس کے باہر کہیں بھی خالی جگہ پر جہاں چاہیں کلک کریں یاد رکھیں کہ اس نقطے والے باکس کو Place Holder کہتے ہیں۔

## نیا ٹیکسٹ آبجیکٹ بنانا

ٹیکسٹ بکس بٹن کو ڈرائنگ ٹول بار سے سلیکٹ کیجیے۔ پوائنٹر کو اس جگہ رکھیے جہاں ٹیکسٹ باکس کو لانا چاہتے ہیں، ماؤس کے بائیں جانب کلک کرنے سے ایک ٹیکسٹ باکس ڈسپلے ہوگا، انٹر دبانے کے بعد بقیہ ٹیکسٹ کے لیے ایک نئی لائن شروع ہوجائے گی۔

## الائمنگ ٹیکسٹ

الائمنٹ یہ ہے کہ آپ کا ٹیکسٹ کس طرح سیٹ کیا ہوا ہے۔ آپ کا متن یا تو بائیں طرف یا دائیں طرف یا درمیانی قطار میں سیٹ ہوسکتا ہے۔

## ٹیکسٹ کی قطار بندی کے لیے:

آپ جس پیراگراف کی قطار بندی چاہتے ہیں اس پیراگراف میں کہیں بھی انسرشن پوائنٹ کو رکھیے۔ فارمیٹ مینو سے الائمنٹ آپشن کو سلیکٹ کریں۔ اب الائمنٹ موڈ متعین کریں اور اسے سلیکٹ کریں۔ (بائیں جانب ڈیفالٹ سیٹ ہوتا ہے۔) فارمیٹنگ ٹول بار سے بھی الائمنٹ آپشن کو سلیکٹ کیا جاسکتا ہے۔

## بلیٹڈ ٹیکسٹ کیا ہے؟

ٹیکسٹ کے اندر خاص نکات پر زور دینے کے لیے یہ بڑے پیمانے پر استعمال ہونے والی لسٹنگ کی ایک شکل ہے۔ پیراگراف کے پوائنٹس کو نمبروں کی لسٹ دینے کے بجائے فارمیٹ مینو کے بلٹ آپشن کے ذریعے مختلف قسم کی علامات کا استعمال کرسکتے ہیں۔

## ٹیکسٹ کے ایک ٹکڑے میں بلیٹ کا اضافہ

فارمیٹ مینو کے بلیٹ آپشن کو سلیکٹ کریں اور موزوں ترین سب مینوز کے ذریعے سمبل کی سائز اور کلر کا انتخاب کریں۔ اسے اپلائی کرنے کے لیے OK بٹن پر کلک کریں۔ اس آپشن کو فارمیٹنگ ٹول بار سے بھی سلیکٹ کیا جاسکتا ہے۔

## مختلف قسم کے فونٹ، اسٹائل اور کلر کا استعمال

ٹیکسٹ کی توسیع میں فونٹس، ٹیکسٹ، اسٹائل، کلر، سائز اور مختلف قسم کے ایفیکٹس وغیرہ شامل ہیں۔ فونٹس کیریکٹروں کے اس مجموعے کو کہتے ہیں جو ایک خاص قسم کے اسٹائل اور حیثیت میں ایک دوسرے کو شیئر کرتے ہیں۔ فونٹ کو بدلنے کے لیے:

اس ٹیکسٹ کو سلیکٹ کریں جسے بدلنا چاہتے ہیں۔

فارمیٹ مینو کے فونٹ آپشن کو سلیکٹ کریں۔

اب اسٹائل، کلر اور سائز وغیرہ بدل سکتے ہیں۔ اگر پریزنٹیشن کے اندر خوبصورتی لانا چاہتے ہیں تو Effects check boxes کا استعمال کرسکتے ہو۔ صحیح فارمیٹنگ کو سلیکٹ کریں اور OK بٹن پر کلک کریں۔

## غلطیوں کی اصلاح اور اسپیل چیک

جب آپ کچھ ٹائپ کرتے ہیں اور آپ کا پاور پوائنٹ تمام الفاظ کو ہرے اور لال رنگ سے انڈرلائن کردیتا ہے، یہ صرف گرامر اور اسپیلنگ کی غلطی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر اپنے ٹیکسٹ کو ایڈٹ یا درست کرنا چاہتے ہیں تو فوراً درج ذیل خاکہ آپ کے ذہن میں آنا چاہیے۔

| | |
|---|---|
| ایروکیز کو پریس کرنا۔ | یہ انسرشن پوائنٹ کو مطلوبہ جگہ لے جاتا ہے۔ |
| Del Key اور Backspace کو پریس کرنا۔ | یہ کرسر کے پہلے یا بعد میں آنے والے کیرکٹر کو مٹا دیتا ہے۔ |
| کسی لفظ پر ڈبل کلک کرنا۔ | پورے الفاظ کو سلیکٹ کرتا ہے۔ |
| کلک کرتے ہوئے ماؤس کو کھینچنا | پورے جملے کو سلیکٹ کرتا ہے۔ |
| لائن یا پیراگراف پر تین بار کلک کرنا | پوری لائن یا پیراگراف کو سلیکٹ کرتا ہے۔ |

## اسپیلنگ چیک کرنے کے لیے

ٹول مینو سے اسپیلنگ آپشن کو سلیکٹ کرنے پر آپ کو کچھ آپشن دکھائی دیں گے، ان آپشن کا استعمال کرکے آپ اپنے مواد کو ٹھیک کرسکتے ہیں۔ مثلاً Ignore (غلطی کو نظرانداز کرنا) Change (غلطی کو درست کرنا) Change all (تمام غلطیوں کو درست کرنا) Ignore all (تمام غلطیوں کو

نظر انداز کرنا) اور Add (جو کچھ موجود نہیں اس کا اضافہ کرنا) وغیرہ۔ اسے بار بار آخر تک دہراتے رہیں یہاں تک کہ اسپیل چیکر ایک ڈائیلاگ باکس دکھائے گا کہ اسپیلنگ چیکنگ کا کام مکمل ہوگیا۔

## سلائڈس اینڈ گرفیا

پاور پوائنٹ کے تمام آبجیکٹس میں Line Color, Fillcolor اور Line style آپشن ہوتے ہیں۔ لائن اسٹائل نیرو (narrow) بولڈ (Bold) ڈیش والے (dashed) اور نقطوں والے (dotted) وغیرہ ہو سکتے ہیں۔

## مزید رنگوں کا اضافہ

کسی بھی آبجیکٹ کو متنوع بنانے کے لیے اسے کلر کریں۔

آبجیکٹ کو سلیکٹ کریں۔

فارمیٹ مینو سے کلر اور لائن آپشن کا انتخاب کریں۔

فارمیٹ آٹوشیپ ڈائیلاگ باکس کھلے گا۔ پہلے سے موجود فل کلر کو ڈسپلے کرنے کے لیے کلرس اور لائنس ٹیب کو سلیکٹ کریں۔

ڈراپ ڈاؤن لسٹ سے دوسرے رنگوں کو سلیکٹ کریں اور اگر آپ فنکارانہ ذہن رکھتے ہیں تو کسٹ کلر کا انتخاب کریں۔

فل ایفیکٹس آپشن کے ذریعے ایک ڈائیلاگ باکس کھلے گا جس میں گریڈینٹ ٹیکسچر پیٹرن اور پکچر وغیرہ آپشن ہوتے ہیں۔

مزید اڈوانس آپشن مثلاً شیڈنگ پیٹرلس فارمیٹ آٹوشیپ وغیرہ استعمال کرسکتے ہیں۔

## کلر اسکیم

کلر اسکیم رنگوں کے اس مرکب مجموعے کو کہتے ہیں جس میں ہر رنگ ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے۔ یہاں پورے طور پر صرف سات کلر اسکیم پائے جاتے ہیں۔ ایسے بہت سے کلر اسکیم موجود ہیں جو بیک گراؤنڈ، ٹیکسٹ اور لائن شیڈوز کی سیٹنگ کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اب دیکھیے کہ کلر اسکیم کے اندر کلر کو کیسے بدلا جاتا ہے۔ فارمیٹ مینو سے سلائڈ کلر اسکیم آپشن کو سلیکٹ کریں۔ کوئی بھی تبدیلی کے لیے اسکیم سلیکٹ کریں۔ اب کسٹم ٹیب کو سلیکٹ کریں۔

اس آئٹم کو سلیکٹ کریں جس کے لیے آپ کلر کو چینج کرنا چاہتے ہیں۔

پھر اپنا پسندیدہ کلر سلیکٹ کریں اور OK بٹن پر کلک کریں۔

## ٹیمپلیٹوں کا استعمال

ٹیمپلیٹس محفوظ کی ہوئی پریزنٹیشن فائلیں ہوتی ہیں، جن کے فونٹس، فونٹ سائز، بیک گراؤنڈ وغیرہ ٹھیک ٹھیک متعین ہوتے ہیں۔

## ٹیمپلیٹ کا انتخاب

فائل مینو سے (New) آپشن کے تحت ایک نئے ٹیمپلیٹ کو چنیں، جنرل ٹیب، بلینک پریزنٹیشن کو پیش کرتے ہیں۔ پریزنٹیشن ڈیزائن کے اندر پیشہ وارانہ طور پر ڈیزائن کی ہوئی ٹیمپلیٹس شامل ہوتی ہیں، جن کے ذریعے آپ اپنا پریزنٹیشن بنا سکتے ہیں۔ پریزنٹیشن میں چند خاص قسم کی ٹیمپلیٹیں ہوتی ہیں۔ نیز اس میں آٹو کنٹینٹ ویزارڈ بھی ہوتا ہے۔ جو ابتدائی طور پر سیکھنے والوں کے لیے بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔

ویب پیجز پریزنٹیشن کو تیار کرنے اور انھیں ویب پیج کے طور پر محفوظ رکھنے میں مدد کرتے ہیں۔

□□□


### اَسّی دن میں دنیا کا سفر

**مصنف: جولس ورن/مترجم: صفدر حسین**

ایک بے حد دلچسپ ناول جس میں ایک اصول پسند اور اولوالعزم آدمی کی کہانی بیان کی گئی ہے جس نے اپنے دوستوں کے ساتھ شرط لگائی تھی کہ وہ اَسّی دن میں پوری دنیا کا سفر طے کرے گا۔ 20 ہزار پونڈ کی اس شرط کو جیتنے کے لیے اس نے اس سے کئی گنا زیادہ رقم خرچ کردی۔ لیکن کیا وہ شرط جیت سکا؟ یہ جاننے کے لیے کتاب کا مطالعہ کریں۔

**صفحات: 170، قیمت: -/21 روپے**

### حیوانات کی دلچسپ دنیا

**مصنف: محمد خلیل**

حیوانات ہماری رنگ برنگی دنیا کے حسن و دلفریبی میں اضافہ بھی کرتے ہیں اور ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں بھی معاون ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں بڑے دلچسپ انداز میں مختلف قسم کے حیوانات مثلاً ڈائنوسور، ہرن، بلی، ہائیڈرا، جگنو، شیر اور چیتا وغیرہ سے متعلق تفصیلات درج ہیں۔ ایک بے حد دلچسپ کتاب جس کو بچوں کے ساتھ بڑے بھی پسند کریں گے۔

**صفحات: 111، قیمت: -/17 روپے**

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، وِنگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مترجم: رئیس احمد

# محمد سعدالحسن خاں سے ایک ملاقات

**سوال: سب سے پہلے آپ اپنی اس شاندار کامیابی کا راز بتائیے۔**

جواب: اولاً تو یہ اللہ تعالیٰ پر میرے یقین کامل اور میرے مرحوم والدین کی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔ بعد ازاں اس میں خود اعتمادی، یقین محکم اور سخت محنت و ریاضت کے ساتھ ساتھ بھائی بہنوں کے اخلاص اور تعاون کا بڑا حصہ ہے۔ ان کے علاوہ میرے احباب نے بھی نہ صرف مواد کی فراہمی میں میری مدد کی بلکہ ان کی حوصلہ افزائیاں بھی کافی حد تک معاون ثابت ہوئیں۔

**سوال: اس کامیابی سے قبل اوّل مقام حاصل کرنے والوں سے متعلق آپ کی کیا رائے تھی؟ اور اب کیا ہے؟**

جواب: میرا خیال تھا کہ اوّل مقام حاصل کرنے والے کچھ خاص اوصاف سے متصف ہوتے ہیں، اور ایک منصوبے کے تحت امتحانات کی تیاری کرتے ہیں اور اب جب کہ میں بھی اسی صف میں کھڑا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ کوئی بھی امیدوار جو صحیح سمت میں خود اعتمادی اور یقینِ کامل کے ساتھ محنت کرے تو وہ اس امتیازی حیثیت تک ضرور پہنچ سکتا ہے۔

**سوال: اس پُروقار مقام تک پہنچنے کے لیے آپ کو کتنی بار کوششیں کرنی پڑیں؟**

جواب: یہ میری چوتھی کوشش تھی اس سے قبل میں خصوصی امتحان (Mains) تک پہنچا تھا۔

**سوال: کیا آپ اس کامیابی کے لیے پُراُمید تھے؟ کامیابی کی اطلاع پاکر آپ کو کیسا لگا؟**

جواب: میں خصوصی امتحان اور بہتر انٹرویو کی بنیاد پر اس حد تک تو پُر امید تھا کہ کامیابی حاصل کرسکوں گا، لیکن اوّل پوزیشن حاصل کرنے کا تو میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس امتیازی کامیابی کی اطلاع مجھے میرے ایک دوست کے ذریعے ملی۔ لسٹ میں اوّل مقام پر اپنے نام کو دیکھ کر میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔

**سوال: ابتدائی اور خصوصی امتحان میں آپ نے کن مضامین کا انتخاب کیا، اور اس انتخاب کی بنیاد کیا تھی؟**

جواب: بہار پبلک سروس کمیشن کے ابتدائی امتحان میں عام معلومات کے علاوہ دیگر مضامین کا انتخاب نہیں کیا جاتا ہے، ہاں خصوصی امتحان کے لیے میں نے اردو زبان و ادب اور محنت اور سماجی بہبود کا انتخاب کیا۔ چونکہ اردو زبان و ادب سے میری گہری دلچسپی رہی ہے۔ مختلف اخبارات اور رسائل و جرائد میں میری کہانیاں شائع ہوتی رہی ہیں اور ریڈیو پر بھی نشر ہوتی رہی ہیں۔ علاوہ ازیں میں سماجی فلاح و بہبود کے کاموں سے بھی وابستہ رہا ہوں، اس کی بنا پر میں نے محنت اور سماجی بہبود کا انتخاب کیا جو حسنِ انتخاب ثابت ہوا۔

**سوال: اس امتحان کی تیاری میں آپ کو سب سے زیادہ کن کتب و رسائل اور اخبارات سے مدد ملی؟**

جواب: اس امتحان کی تیاری میں 'ہندوستان'، 'دی ٹائمس آف انڈیا'، 'دینک جاگرن' اور 'قومی تنظیم' کے علاوہ 'پرتیوگتا درپن'، 'سامانیہ گیان درپن' اور 'یوجنا' خاص طور سے میرے مطالعے میں رہے۔ 'پرتیوگتا درپن' کے خاص شماروں نے میری کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔

**سوال: آپ نے ابتدائی اور خصوصی امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے جو تیاریاں کیں ان سے واقف کرائیے۔**

جواب: ابتدائی امتحان میں تو معلوماتِ عامہ سے متعلق عمومی نوعیت کے سوالات پوچھے جاتے ہیں اور اس کے تحت کئی مضامین (تاریخ، جغرافیہ اور سیاسیات وغیرہ) آتے ہیں جس کے لیے عمیق اور تقابلی مطالعہ لازمی ہوتا ہے، اس کے لیے میں نے 'یونیک گائڈ'، 'پرتیوگتا درپن' اور بعض دیگر خصوصی امتحان کے لیے میں نے 'اردو زبان و ادب'، 'محنت اور سماجی بہبود' سے متعلق معیاری کتب کا نہ صرف تجزیاتی مطالعہ کیا بلکہ ضروری نوٹ بھی تیار کیے۔

اس کے علاوہ 'پرتیوگتا درپن' کے خاص شمارے 'یونیک گائڈ'، 'اسپیکٹرم انڈیا' اور 'منورما میریز' کی کتابوں کے مطالعے کی بنیاد پر نوٹ تیار کرنے کے ساتھ ساتھ وقت بروقت اپنے احباب کے ساتھ مختلف موضوعات پر بحث و مباحثے نے بھی میری مدد کی۔

**سوال: آپ نے انٹرویو کے لیے تیاری کس طرح کی؟**

جواب: میں نے حالیہ واقعات و حالات کی جانکاری کے لیے اخباروں اور متعلقہ رسائل و جرائد کے مطالعے کے علاوہ اپنے احباب سے بھی رجوع کیا، ساتھ ہی ساتھ اپنے اختیاری مضامین کو بھی شاملِ مطالعہ رکھا۔ علاوہ ازیں 'ہومیر کیریئر گائیڈینس' کے بعض مصنفین اور چند احباب نے 'موک انٹرویو' (فرضی انٹرویو) کے ذریعے میری رہنمائی کی جس سے مجھے کافی مدد ملی۔

---

● **محمد سعدالحسن خاں بن محمد وسیع الحسن خاں نے بہار پبلک سروس کمیشن کے 45ویں مشترکہ امتحان میں اوّل مقام حاصل کرکے بلاشبہ ایک قابلِ فخر کارنامہ انجام دیا ہے، جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ محمد سعدالحسن خاں نے 1989، 1991 اور 1994 میں بالترتیب میٹرک (70%) انٹرمیڈیٹ (69%) اور بی۔اے۔ کے امتحان (64%) اوّل درجے میں پاس کیے تھے۔ ان کی ادبی دلچسپیوں میں اردو غزل اور افسانے لکھنا بطور خاص شامل ہیں۔ خالی اوقات میں انہیں کرکٹ اور کیرم کھیلنا بہت پسند ہے۔ ان کے ساتھ کی گئی ایک گفتگو ہندی ماہنامہ "پرتیوگتا درپن" اپریل 2005 کے حوالے سے قارئین "اردو دنیا" کی نذر ہے۔**

**سوال: انٹرویو میں کس قسم کے سوالات پوچھے گئے؟**

جواب: یہ سوالات بالترتیب اس طرح تھے۔

(الف) بچہ مزدوری کے اسباب اور اس کی روک تھام کے لیے مناسب لائحۂ عمل بتایئے؟

(ب) یوم مئی منانے کا رواج کہاں سے شروع ہوا، اور دنیا میں دو کون سے ایسے ملک ہیں جہاں یہ نہیں منایا جاتا؟

(ج) بچہ جرائم سے آپ کیا سمجھتے ہیں، اس کے اسباب اور حل کیا ہیں؟

(د) روز افزوں جرائم کے کیا اسباب ہیں، اور ان پر کیسے قابو پایا جاسکتا ہے؟

'اردو زبان و ادب'

(الف) ''سب رس'' کے مصنف کا نام اور عہد بتایئے۔

(ب) ''دکنی ادب'' سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

(ج)(i) شاد عظیم آبادی کے کچھ اشعار سنایئے۔

(ii) اور بعض اشعار کی تشریح کے لیے بھی کہا گیا۔

**سوال: اگر انٹرویو کے دوران میں آپ سے کوئی خاص/دلچسپ سوال کیا گیا ہو تو وہ سوال اور اس کا جواب بتاتے ہوئے ممتحن کے ردّعمل پر بھی روشنی ڈالیے۔**

جواب: اس ذیل میں مجھ سے کہا گیا تھا کہ 'امیدواروں کی بڑی تعداد اپنی ترجیحات میں 'پولیس سروس' کو اوّلیت دیتی ہے اس کے برعکس آپ نے اپنی ترجیحات میں 'ایڈمنسٹریٹو سروس' کو اوّلیت دی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ اس پر میرا جواب تھا کہ— 'مجھے ایک پولیس آفیسر کی بہ نسبت ایک ایڈمنسٹریٹو آفیسر کی حیثیت سے مختلف منصوبوں اور یوجناؤں کے تحت قدم قدم پر عوام الناس کی خدمت کا موقع حاصل ہو سکے گا، زیادہ تر جرائم بھی سماجی پس منظر میں ہی جنم لیتے ہیں، اگر ابتدائی مراحل میں ہی ان پر قابو پالیا جائے تو سماج میں پیدا ہونے والے جرائم خود بخود ہی ختم ہو جائیں گے۔ میرے اس جواب سے بورڈ کے جملہ ممبران مطمئن نظر آئے۔

**سوال: انٹرویو کی تیاری میں کون سی حکمتِ عملی آپ کے لیے سب سے زیادہ معاون ثابت ہوئی؟**

جواب: دوستوں کے ساتھ بحث و مباحثہ اور کیریئر گائڈینس کے بعض مصنفین کے ساتھ موک انٹرویو میری اس کامیابی میں مزید معاون ثابت ہوئے۔

**سوال: آپ کو امتحان کی تیاری میں کسی کمی یا بھول کا احساس ہوا؟**

جواب: مجھے کسی بھی طرح کی بھول یا کمی کا احساس نہیں ہوا۔

**سوال: آپ کے بایوڈاٹا میں ادبی اور غیر ادبی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا کافی ذکر ہے؟ آپ اپنے مطالعے اور دلچسپیوں میں کس طرح توازن رکھتے ہیں؟**

جواب: میں روزانہ چھ سات گھنٹے مطالعہ کرتا تھا اور خالی اوقات میں ہی اپنی ادبی اور غیر ادبی سرگرمیوں اور دلچسپیوں پر اپنی توجہ مرکوز کرتا تھا۔

**سوال: اس امتحان میں میڈیم کی کیا اہمیت ہے؟ ہندی میڈیم سے تیاری کرنے پر آپ کی کیا رائے ہے؟**

جواب: جہاں تک میرا تعلق ہے، میں یہ مانتا ہوں کہ امتحان میں میڈیم کا کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ اگر کسی بھی زبان پر عبور اور اپنے خیالات کے اظہار کا سلیقہ حاصل ہو تو وہی سب سے بڑا ذریعہ اور میڈیم ہے۔ اس بنیاد پر متعلقہ امتحان میں بہتر نمبر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ میرا میڈیم 'ہندی زبان' تھا اور رزلٹ سے میں مطمئن ہوں۔

**سوال: کیا امیدوار کا اقتصادی اور سماجی پس منظر اس کے تعلیمی سلسلے کو متاثر کرتا ہے؟ اگر یہ سچ ہے تو کس طرح؟**

جواب: یہ سچ ہے کہ امیدوار کے سماجی اور اقتصادی پس منظر کا اثر کسی نہ کسی طرح امیدوار کے علمی سفر اور تعلیمی سلسلے کو متاثر کرتا ہے، لیکن خود اعتمادی، سخت محنت اور بلند حوصلہ ناموافق حالات کو بھی موافق اور سازگار بنا دیتا ہے۔

**سوال: اس طرح کے امتحان کے لیے ایک معیاری رسالے کی آپ کے نزدیک کیا خصوصیات ہونی چاہئیں؟**

جواب: میرے نزدیک اس طرح کے امتحانات کے لیے معیاری رسالے میں جن خصوصیات کا ہونا لازمی ہے وہ اس طرح ہیں۔

(الف) خصوصی مطالعہ (ب) استناد اور موضوعاتی تنوع

(ج) مکمل رہنمائی اور قابلِ اعتماد مواد کا شامل ہونا وغیرہ۔

**سوال: کیا آپ نے اس امتحان کے لیے کوئی کوچنگ کی تھی؟**

جواب: کوچنگ کی بنیاد پر کوئی بھی امیدوار کامیاب نہیں ہوسکتا، یہ تو محض ضروری ہدایات دے سکتی ہے۔ کامیابی تو خود امیدوار کی جانب سے صحیح سمت میں کی جانے والی تیاری، محنت اور خود اعتمادی کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے۔

**سوال: ایڈمنسٹریٹو سروس میں جانے پر فرائض کی ادائیگی کے ذیل میں آپ کی ترجیحات میں کسے اولیت حاصل ہوگی؟**

جواب: قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے نہایت ذمّے داری اور ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ہر طبقے کے افراد کی خدمت کرنا اور ایڈمنسٹریٹو سروس کو قابلِ اعتماد بنانا۔

**سوال: آپ آئندہ امتحان کے امیدواروں اور قارئین کو کیا صلاح و مشورہ دیں گے؟**

جواب: ناسازگار حالات اور ابتدائی ناکامیوں سے قطعاً پریشان نہ ہوں، کیونکہ ناکامیاں ہی کامیابیوں کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ صحیح سمت میں لگن اور محنت کے ساتھ کامل یقین اور خود اعتمادی کی بنیاد پر کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ ہمیشہ ذہن نشیں رکھنا چاہیے کہ

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں

(بہ شکریہ ہندی ماہنامہ ''پرتیوگتا درپن'' اپریل 2005)

محمد عاشق خاں

کوئز

# اُردو ناول

کوئز کے صحیح جوابات بھیجنے والے قارئین کو بالترتیب پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام دیا جائے گا۔ پہلا انعام 500 روپے، دوسرا انعام 300 روپے اور تیسرا انعام 200 روپے پر مشتمل ہے۔ انعام کے طور پر کونسل کی مطبوعات ارسال کی جائیں گی۔ آپ کے جوابات ہمیں اس مہینے کی 15 تاریخ تک موصول ہو جانے چاہئیں۔ (ادارہ)

(1) فسانۂ مبتلا اور ''ایامیٰ'' کے مصنف کون ہیں؟
(الف) نذیر احمد (ب) عبدالحلیم شرر
(ج) رتن ناتھ سرشار (د) مرزا ہادی رسوا

(2) ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کس کی تخلیق ہے؟
(الف) قاضی عبدالستار (ب) خواجہ احمد عباس
(ج) عزیز احمد (د) انتظار حسین

(3) شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کس ناول نگار نے زیادہ خوبصورتی سے کیا ہے؟
(الف) کرشن چندر (ب) قرۃ العین حیدر
(ج) خواجہ احمد عباس (د) عصمت چغتائی

(4) ''آگ کا دریا'' کے علاوہ کس ناول میں شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال ہوا ہے؟
(الف) لہو کے پھول (ب) شکست
(ج) گئودان (د) لندن کی ایک رات

(5) پریم چند کے نامکمل ناول کا نام کیا ہے؟
(الف) پردۂ مجاز (ب) غبن
(ج) نرملا (د) منگل سوتر

(6) ''ایک گدھے کی سرگذشت'' کس کی تخلیق ہے؟
(الف) عصمت چغتائی (ب) کرشن چندر
(ج) راجندر سنگھ بیدی (د) سعادت حسن منٹو

(7) ''ابن الوقت'' نذیر احمد کا ناول ہے، بتائیے ''بنت الوقت'' کس کی تصنیف ہے؟
(الف) راشد الخیری (ب) رتن ناتھ سرشار
(ج) عبدالحلیم شرر (د) رجب علی بیگ سرور

(8) ''زوال بغداد'' کے مصنف کون ہیں؟
(الف) راشد الخیری (ب) عبدالحلیم شرر
(ج) مرزا رسوا (د) جیلانی بانو

(9) قرۃ العین حیدر کے پہلے ناول کا نام بتائیے؟
(الف) آگ کا دریا (ب) کارِ جہاں دراز ہے
(ج) میرے بھی صنم خانے (د) چاندنی بیگم

(10) ''اور انسان مر گیا'' کس ناول نگار کی تخلیق ہے؟
(الف) خواجہ احمد عباس (ب) بلونت سنگھ
(ج) جوگیندر پال (د) رامانند ساگر

(11) ''نادید'' دورِ جدید کے کس ناول نگار کا ناول ہے؟
(الف) رام لعل (ب) انتظار حسین
(ج) خدیجہ مستور (د) جوگیندر پال

(12) عبداللہ حسین کس مشہور ترین ناول کے مصنف ہیں؟
(الف) دو گز زمین (ب) لہو کے پھول
(ج) آگ کا دریا (د) اُداس نسلیں

(13) ''خدا کی بستی'' کس پاکستانی ناول نگار کا ناول ہے؟
(الف) انتظار حسین (ب) خدیجہ مستور
(ج) شوکت صدیقی (د) ممتاز مفتی

(14) اردو کا کون سا ناول سب سے زیادہ ضخیم ہے؟
(الف) اُداس نسلیں (ب) لہو کے پھول
(ج) خدا کی بستی (د) آگ کا دریا

(15) عصمت چغتائی کا سب سے پہلا ناول کون سا ہے؟
(الف) ٹیڑھی لکیر (ب) دل کی دنیا
(ج) ضدی (د) معصومہ

(16) کس ناول میں صرف ایک رات کی کہانی پیش کی گئی ہے؟
(الف) آخر شب کے ہمسفر (ب) لندن کی ایک رات
(ج) گریز (د) ضدی

(17) ناول ''صبح زندگی'' کے مصنف کون ہیں؟
(الف) نذیر احمد (ب) رتن ناتھ سرشار
(ج) شرر (د) راشد الخیری

(18) مندرجۂ ذیل کتابوں میں ناولٹ کا جوڑا کون ہے؟
(الف) حضرت جان اور دارا شکوہ (ب) ایک چادر میلی سی اور ضدی

(ج) سات رنگ اور اداس نسلیں (د) سلوٹیں اور نادید

**(19)** کس ناول نگار نے زیادہ تر اصلاحی ناول تصنیف کیے ہیں؟

(الف) مرزا رسوا (ب) صالحہ عابد حسین

(ج) نذیر احمد (د) شرر

**(20)** "دارا شکوہ" اور "صلاح الدین ایوبی" کے مصنف کون ہیں؟

(الف) عبدالحلیم شرر (ب) قاضی عبدالغفار

(ج) قاضی عبدالستار (د) رتن ناتھ سرشار

**(21)** "گوری سوئے سیج پر" کس کا ناول ہے؟

(الف) صالحہ عابد حسین (ب) خدیجہ مستور

(ج) رضیہ فصیح احمد (د) ممتاز مفتی

**(22)** "پاکستان ایکسپریس" کس کی تخلیق ہے؟

(الف) کرشن چندر (ب) جوگیندر پال

(ج) بلونت سنگھ (د) خشونت سنگھ

**(23)** کرشن چندر کے آخری ناول کا نام کیا ہے؟

(الف) ایک وائلن سمندر کے کنارے (ب) گدھے کی واپسی

(ج) دادر پل کے بچے (د) فٹ پاتھ کے فرشتے

**(24)** "نیلی ساڑی" کس ناول نگار کی تخلیق ہے؟

(الف) سہیل عظیم آبادی (ب) خواجہ احمد عباس

(ج) منٹو (د) جیلانی بانو

**(25)** اردو کے پہلے ناول نگار کون ہیں؟

(الف) اکبر الہ آبادی (ب) نذیر احمد

(ج) سرشار (د) شرر

**(26)** وہ کون سا ناول ہے جو ہمارے ملک کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے؟

(الف) خدا کی بستی (ب) لہو کے پھول

(ج) آگ کا دریا (د) اداس نسلیں

**(27)** "بازارِ حسن" کس مشہور ناول نگار کی تصنیف ہے؟

(الف) پریم چند (ب) عصمت چغتائی

(ج) سہیل عظیم آبادی (د) راجندر سنگھ بیدی

**(28)** "مصورِ غم" کس ناول نگار کو کہا جاتا ہے؟

(الف) عبدالحلیم شرر (ب) وحید الدین سلیم

(ج) راشد الخیری (د) فرحت اللہ بیگ

**(29)** مندرجۂ ذیل ناولوں میں سے کون سا ناول پریم چند کا نہیں ہے؟

(الف) شب گزیدہ (ب) میدان عمل

(ج) چوگان ہستی (د) غبن

**(30)** مراۃ العروس و بنات النعش کس کے ناول ہیں؟

(الف) عبدالحلیم شرر (ب) رجب علی بیگ سرور

(ج) نذیر احمد (د) سرشار

**(31)** ذیل میں سے کون سے دو ناول مرزا رسوا کے ہیں؟

(الف) امراؤ جان ادا و فسانۂ مبتلا (ب) امراؤ جان ادا و حرف شیریں

(ج) کار جہاں دراز ہے و امراؤ جان ادا (د) امراؤ جان ادا و شریف زادہ

**(32)** "ہوس" کس کا ناول ہے؟

(الف) حیات اللہ انصاری (ب) عزیز احمد

(ج) جوگیندر پال (د) قاضی عبدالستار

**(33)** "راجہ گدھ" کس کا ناول ہے؟

(الف) خواجہ احمد عباس (ب) ممتاز مفتی

(ج) بانو قدسیہ (د) رضیہ فصیح احمد

**(34)** کس ناول نگار نے لڑکیوں کے لیے دو مشہور رسالے نکالے؟

(الف) شرر (ب) سرشار

(ج) نذیر احمد (د) راشد الخیری

**(35)** "ٹیڑھی لکیر" کس ناول نگار کی تصنیف ہے؟

(الف) کرشن چندر (ب) منٹو

(ج) عصمت چغتائی (د) قرۃ العین حیدر

**(36)** "لڑکیوں کا سرسید" کس ناول نگار کو کہا جاتا ہے؟

(الف) راشد الخیری (ب) نذیر احمد

(ج) شرر (د) سرشار

**(37)** عبدالصمد کا مقبول ترین ناول مندرجۂ ذیل میں کون سا ہے؟

(الف) ایوان غزل (ب) گریز

(ج) دو گز زمین (د) روحی

**(38)** اردو کے کس ناول نگار کو اردو کی "ورجینیا وولف" کہا جاتا ہے؟

(الف) عصمت چغتائی (ب) واجدہ تبسم

(ج) قرۃ العین حیدر (د) جمیلہ ہاشمی

**(39)** مندرجۂ ذیل میں سے عزیز احمد نے کون سا ناول لکھا ہے؟

(الف) پڑوسن (ب) ضدی

(ج) اداس نسلیں (د) گریز

**(40)** "لہو کے پھول" کے خالق کون ہیں؟

(الف) ممتاز مفتی (ب) انتظار حسین

(ج) حیات اللہ انصاری (د) شوکت حیات

**(41)** عبدالصمد کو مندرجۂ ذیل ناولوں میں سے کس پر ساہتیہ اکادمی انعام ملا؟

(الف) پس دیوار (ب) دو گز زمین

(ج) تلاش بہاراں (د) لہو کے پھول

(42) "تلاش بہاراں" کس کی تصنیف ہے؟

(الف) قرۃ العین حیدر (ب) جمیلہ ہاشمی

(ج) عبدالصمد (د) انتظار حسین

(43) مندرجۂ ذیل ناولوں میں سے کون سا ناول کرشن چندر کا نہیں ہے؟

(الف) جب کھیت جاگے (ب) طوفان کی کلیاں

(ج) دادر پل کے بچے (د) گوشۂ عافیت

(44) گوتم نیلمبر کس ناول کا کردار ہے؟

(الف) لہو کے پھول (ب) آگ کا دریا

(ج) خدا کی بستی (د) شکست

(45) مندرجۂ ذیل ناولوں میں سے کون سا ناول نذیر احمد کا نہیں ہے؟

(الف) مراۃ العروس (ب) بنات النعش

(ج) بنت الوقت (د) ابن الوقت

(46) "ایک چادر میلی سی" کس کا ناول ہے؟

(الف) خواجہ احمد عباس (ب) رام لعل

(ج) راجندر سنگھ بیدی (د) حیات اللہ انصاری

(47) کس ناول میں لکھنؤ کے زوال کی عکاسی کی گئی ہے؟

(الف) گریز (ب) میرے بھی صنم خانے

(ج) اُداس نسلیں (د) شام اودھ

(48) قاضی عبدالستار نے کس ناول کو صرف 9 دن میں مکمل کیا؟

(الف) داراشکوہ (ب) شب گزیدہ

(ج) صلاح الدین ایوبی (د) حضرت جان

(49) "فردوس خیال" پریم چند کا افسانوی مجموعہ ہے۔ "فردوس بریں" کس کا ناول ہے؟

(الف) عبدالحلیم شرر (ب) سرشار

(ج) مرزا رسوا (د) پریم چند

(50) "قمری چوڑی والی" کس کی تخلیق ہے؟

(الف) عبدالحلیم شرر (ب) سرشار

(ج) نذیر احمد (د) راشد الخیری

(51) ناول "فائر ایریا" کے مصنف کا نام بتایئے؟

(الف) غیاث احمد گدی (ب) سہیل عظیم آبادی

(ج) الیاس احمد گدی (د) جوگیندر پال

(52) اردو ناول کا "بابا آدم" کس کو کہا جاتا ہے؟

(الف) پریم چند (ب) نذیر احمد

(ج) مرزا رسوا (د) قرۃ العین حیدر

## ہمیں مئی کے کوئز انعامی مقابلے کے متعدد جوابات موصول ہوئے۔

جانچ کے بعد درج ذیل حضرات کو بالترتیب اوّل، دوم اور سوم انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

1. **محمد پرویز عالم**
204، ریجنسی لاج، نزد شمیم ٹی اسٹال،
رمنا روڈ، پٹنہ-800004

2. **ایس۔ کے۔ معین الدین**
114، ڈی۔ ایس۔ کوٹھاری ہاسٹل
دہلی یونیورسٹی، دہلی-110007

3. **محمد سہیل**
1/22، ذاکر نگر، جامعہ نگر،
نئی دہلی-110025

انعام یافتگان کو ادارے کی طرف سے مبارک باد۔

آپ کے انعامات جلد ہی بذریعۂ ڈاک ارسال کردیے جائیں گے۔

(ادارہ)

## پچھلے انعامی مقابلے ("سائنس کوئز") کے صحیح جوابات یہ ہیں:

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| 1. الف | 2. ب | 3. د | 4. ب | 5. الف |
| 6. ج | 7. الف | 8. ب | 9. ب | 10. د |
| 11. د | 12. ب | 13. د | 14. ب | 15. ج |
| 16. ج | 17. د | 18. الف | 19. الف | 20. ج |
| 21. ب | 22. ب | 23. د | 24. ب | 25. ب |
| 26. الف | 27. الف | 28. ب | 29. الف | 30. الف |
| 31. الف | 32. ج | 33. د | 34. ب | 35. ج |
| 36. ب | 37. د | 38. الف | 39. ب | 40. الف |
| 41. ج | 42. ب | 43. د | 44. ب | 45. الف |
| 46. ج | 47. ج | 48. د | 49. ج | 50. الف |

محمد انعام الحق

کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-23

# بڑھتے قدم

**اعجاز حسین** نے، جن کے والدایک اسکول میں استاد ہیں، ابتدائی تعلیم سمستی پور، بہار میں حاصل کی۔ بعد ازاں ایم۔اے، ڈی۔سی۔اے، ڈی۔ایم۔ایل۔ٹی۔ اور ڈی۔اے۔پی۔ وغیرہ کورس کیے۔ انھوں نے ملّت انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی سمستی پور سے ایک سالہ کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی۔ٹی۔پی۔ کورس کیا اور اس کی بدولت آج برسرِروزگار ہیں۔ ان کا مختصر انٹرویو قارئینِ "اردو دنیا" کے لیے پیش ہے۔

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: کمپیوٹر سے مجھے شروع سے گہری دلچسپی تھی۔ جہاں تک اس سے دلچسپی پیدا ہونے کی وجہ کا سوال ہے تو ابتدا میں تو مجھے اس وجہ سے دلچسپی پیدا ہوئی کہ یہ بالکل نئی اور انوکھی چیز معلوم ہوتی تھی لیکن اب اس سے دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ اس دور کی ضرورت ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: ان سینٹروں کی ویسے تو کئی خصوصیات ہیں لیکن ان سب سے اہم یہ ہے کہ یہاں پر اردو کا سافٹ ویئر پڑھایا جاتا ہے، دوسرے کمپیوٹر سینٹروں کے مقابلے میں فیس بھی کم ہے، حکومت کی جانب سے سرٹیفکیٹ بھی ملتا ہے جس سے نوکری حاصل کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جارہی ہے، اُس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: میں اس سے پوری طرح مطمئن ہوں، طرزِ تعلیم و تربیت بہت عمدہ ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں روز افزوں بہتری آرہی ہے۔ یہاں سہولیات بھی دیگر سینٹروں کی بہ نسبت زیادہ ملتی ہیں اور اساتذہ کا رویّہ بہت اچھا ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اُردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں بہت معاون ہیں۔ انھی کی بدولت اس انفارمیشن اور ٹیکنالوجی کے زمانے میں اردو داں طبقہ خود کفیل ہو رہا ہے اور اس کی خود اعتمادی میں اضافہ ہو رہا ہے۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے، اچھا لگ رہا ہے۔ اپنے آپ کو زمانے کے ساتھ ساتھ محسوس کر رہا ہوں، کسی سے کمتر نہیں۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خود اعتمادی اور خود انحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: کافی بدلاؤ آیا ہے۔ خود اعتمادی اور خود انحصاری میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ آج میں اپنے آپ کو ہر اس کام کے لیے موزوں پاتا ہوں جو انفارمیشن اور ٹیکنالوجی کا حصہ ہے اور دورِ حاضر کی ضرورت۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ یہ آپ کے لیے ایک بے حد مثبت چیز ہے۔ آپ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

جواب: دوسروں سے دو قدم آگے اور یہی چیزیں بسا اوقات ہمیں دوسروں پر سبقت لے جانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی، وہ آپ کے لیے بوجھ تو نہ تھی؟

جواب: میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ کونسل کے سینٹروں کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ یہاں فیس مناسب ہی نہیں بلکہ کافی کم ہے، اس لیے کم از کم میرے لیے تو اس کی ادائیگی بوجھ نہ تھی۔

□□□

# اردو خبر نامہ

## ''ونگس آف فائر'' کا اردو ترجمہ ''پرواز'' صدر جمہوریہ کو پیش

● نئی دہلی، 18/اپریل۔ صدر جمہوریہ عالی جناب ڈاکٹر اے. پی. جے عبدالکلام کو ان کی خودنوشت سوانح ''ونگس آف فائر'' کا اردو ترجمہ ''پرواز'' 18/اپریل 2005 کو پیش کیا گیا۔ کتاب کا اردو ترجمہ (مترجم حبیب الرحمٰن چغانی) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل نے شائع کیا ہے اور اس کا Audio Version ممتاز فلم ہدایت کار، شاعر اور ادیب جناب گلزار نے تیار کیا ہے۔

صدر جمہوریہ کو یہ کتاب قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے پیش کی۔ اس کتاب کا پیش لفظ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے تحریر کیا ہے جس میں انھوں نے ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام کی شخصیت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ خودنوشت ایک عام آدمی کی کہانی ہے جس نے اپنے آپ کو ہمیشہ عام ہندستانی کے طور پر Identify کیا ہے لیکن یہ کتاب موجودہ ہندستان کی ترقی کی تاریخ بھی ہے۔

گذشتہ دنوں پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف اور ان کی اہلیہ محترمہ صہبا مشرف کے ہندستان کے دورے کے موقعے پر صدر جمہوریہ ہند نے انھیں بطور تحفہ ''پرواز'' کی کاپیاں پیش کی تھیں۔

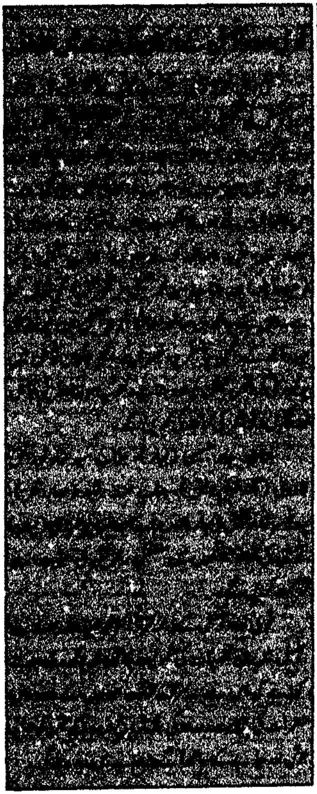

## سہ روزہ ادبی اجتماع ''نئے پرانے چراغ''

● نئی دہلی، 30/اپریل۔ اردو اکادمی، دہلی کی طرف سے دہلی کے قلم کاروں کے سہ روزہ ادبی اجتماع ''نئے پرانے چراغ'' کا افتتاح غالب اکادمی، بستی حضرت نظام الدین میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کیا۔ انھوں نے اپنے افتتاحی خطاب میں ادب کے ساتھ ساتھ زبان کے فروغ کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اگر زبان زندہ رہے گی تو ادب بھی زندہ رہے گا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے خواجہ حسن ثانی نظامی نے کہا کہ قوت اظہار کی کمی تمام زبانوں کے ادب کا بنیادی المیہ ہے۔ مہمان ذی وقار ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے کہا کہ اس حقیقت کے باوجود کہ اردو لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد میں کمی آئی ہے، اردو بولنے والوں کی تعداد کم ہوتی نظر نہیں آتی جو ایک خوش آئند امر ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ محض حکومتوں کی سرپرستی سے زبان کو نہیں بچایا جاسکتا بلکہ اس کے لیے خود اہل زبان کو بھی آگے آنا پڑے گا۔ اس موقعے پر سید شاہد مہدی نے اکادمی کی شائع کردہ پروفیسر محمد حسن کی کتاب ''طرز خیال'' کا اجرا کیا۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے ابتدائی کلمات میں ''نئے پرانے چراغ'' کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ اس اجلاس کی نظامت انیس اعظمی نے کی۔ تحقیق و تنقید پر مبنی پہلے اجلاس کی مجلس صدارت میں شریک پروفیسر شریف احمد نے اس اجتماع کو ایک ورکشاپ سے تعبیر کیا۔ اس میں ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر جلال انجم، ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر شاہینہ تبسم، ڈاکٹر ندیم احمد، ڈاکٹر ارشاد نیازی، ڈاکٹر تنویر احمد، عمیر منظر، آصف اقبال اور نوشاد عالم نے مقالے پیش کیے۔ تخلیقی نثر پر مشتمل دوسرے اجلاس کی صدارت معروف افسانہ نگار جوگندر پال نے کی۔ اس موقعے پر عبدالرحمٰن نے لسانیات کے حوالے سے گفتگو کی اور منظور عثمانی، اظہار عثمانی، محمود حیدر نقوی، انجم عثمانی، غیاث الرحمٰن، رئیس صدیقی، ذکیہ ظفر، مراد کرہانی، علی احمد ادریسی، رضوان الحق، قدسیہ نصیر اور نشا خاتون نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ نظامت ڈاکٹر عقیل احمد نے کی۔ آخر میں مخمور سعیدی کی صدارت میں محفل شعر و سخن منعقد کی گئی جس کی نظامت معین شاداب نے کی۔

اس سہ روزہ اجتماع کا اختتام 2 مئی کو ہوا۔ اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی نے پروگرام کی کامیابی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے تمام شریک قلم کاروں اور شائقین شعر و ادب کے تئیں اظہار تشکر کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ گذشتہ تیرہ چودہ برسوں کے دوران مختلف علاقوں میں تقریباً 325 مراکز کے ذریعے کم وبیش پونے دو لاکھ افراد کو اردو رسم الخط سے آشنا کرایا جا چکا ہے، جس میں بڑی تعداد خواتین کی ہے۔

آخری دن کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر ساحل احمد، پروفیسر عبدالحق اور ڈاکٹر فرخ جلالی نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے ''نظمیہ شاعری میں سورج کی اساطیری معنویت'' ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے ''تذکرہ اور طرز آزاد'' ڈاکٹر فیضان حسن نے ''سیماب امروہوی کی شاعری'' ڈاکٹر توقیر احمد خاں نے'' اردو شاعری میں سماعتی پیکر'' ڈاکٹر مظہر احمد نے ''تضمین بطور حربۂ طنز و مزاح''، ڈاکٹر ظلِ ہما نے'' مرقع رسوم دہلی: ایک تعارف''، ڈاکٹر عشرت ہاشمی نے'' اردو محاورات کا تہذیبی مطالعہ''، ڈاکٹر جمیل اختر نے'' اردو میں زنانہ صحافت''، ڈاکٹر شکیل اختر نے'' نثار احمد کی نثری تحریریں'' سرور الہدیٰ نے ''بلراج مینرا کی کہانی''، حسن مثنیٰ نے'' علامہ جمیل مظہری کی عشقیہ شاعری''، ابوظہیر ربانی نے'' فورٹ ولیم کالج کے اثرات اردو ادب پر (نوآبادیاتی نظام)'' قمر الحسن نے'' دہلی میں اردو صحافت''، عصمت پروین نے'' اردو شاعری اور قومی یکجہتی'' اور محمد انعام الحق نے'' قرۃ العین حیدر کے چار ناولٹ کا تنقیدی تجزیہ'' پر مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر عمر فاروق نے اس جلسے کی نظامت کی۔

دوپہر بعد تخلیقی نثر کے لیے مخصوص جلسے کی صدارت سراج پراچہ، اظہار اثر، پروفیسر شکیل اختر فاروقی اور پروفیسر اشتیاق عابدی نے کی۔ صدر مجلس نے اردو زبان و ادب کو زندہ رکھنے کے لیے اردو رسم الخط کو قائم رکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔

اس موقعے پر اقبال انصاری، بلقیس ظفیر الحسن، رضا امام، اقبال مہدی نے بالترتیب'' مسز سلامت علی'' پریتی کی نانی، بھوت کی کہانی اور'' اللہ کیا زمانہ آگیا'' کے عنوان سے افسانے سنائے۔ ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے علی باقر پر خاکہ پڑھا جبکہ خسرو متین نے'' ہم بھی فن کار ہیں'' اور سعید اختر اعظمی نے'' مسکرا ئیے تو سہی'' کے عنوان سے انشائیے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت محمد یامین نے کی۔ آخر میں مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت گلزار دہلوی اور نظامت اقبال اشہر نے کی۔ پہلے اجلاس کے اختتام پر خاندان غالب کے ایک فرد احسن فریدی فاروقی کی وفات پر خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

## تمل ناڈو اردو اکادمی کی تشکیل نو

● چنئی۔ تمل ناڈو گورنمنٹ اردو اکادمی کی گورننگ کونسل کی تشکیل عمل میں آگئی ہے۔ تمل ناڈو حکومت کے جاری کردہ حکم نامے کے مطابق جناب اشفاق الرحمٰن انڈر سکریٹری برائے ہائر ایجوکیشن حکومت تمل ناڈو اس کے ایکس افیشیو سکریٹری/ رجسٹرار ہوں گے۔

چیئرمین: عزت مآب ریاستی وزیر تعلیم

وائس چیئرمین: جناب محمد عبدالعلی

افسر ممبران (سرکاری)

الف) ڈیولپمنٹ کمشنر اور پرنسپل سکریٹری برائے محکمۂ مالیات

ب) سرکاری معتمد برائے محکمۂ اعلیٰ تعلیمات

ج) سرکاری معتمد محکمۂ پسماندہ وانتہائی پسماندہ واقلیتی بہبود

د) معتمد/ رجسٹرار

اردو زبان کے پندرہ ادیب

جناب مختار بدری، ڈاکٹر ذاکرہ ام شمیلا، شری ہربجن سنگھ، ڈاکٹر سید سجاد حسین، جناب اے محمد اشرف، جناب کے ملک العزیز، جناب حیات باشا، پروفیسر ڈی نثار احمد، جناب عزیز الرحمٰن قریشی، ڈاکٹر بشیر الحق، جناب سی عبدالمالک، ڈاکٹر سید کرامت اللہ بھمنی، محترمہ اے نسیمہ بانو، جناب حافظ ظفر الحق شاکر۔ جناب اے جی احمد حسین۔ (ڈاک سے)

## غالب انسٹی ٹیوٹ اور اسٹیٹ اورینٹل انسٹی ٹیوٹ تاشقند کے درمیان معاہدہ

● نئی دہلی۔ ہمارے ملک کے تہذیبی رشتے جن ملکوں کے ساتھ قدیم زمانوں سے قائم رہے ہیں ان میں وسط ایشیا کا علاقہ ہمیشہ سب سے اہم رہا ہے۔ ہمارے ملک کے سب سے اہم شاعروں میں مرزا اسد اللہ خاں غالب ہیں جن کا خاندان سمرقند (موجودہ ازبکستان) سے ہندوستان آیا تھا۔ غالب کی یادگاریں دہلی اور دہلی سے باہر موجود ہیں۔ ان میں سے ایک اہم ادارہ غالب انسٹی ٹیوٹ ہے جو ہندوپاک میں ہی نہیں بلکہ عالمی پیمانے پر جانا جاتا ہے۔ حال ہی میں غالب انسٹی ٹیوٹ اور ازبکستان کے اسٹیٹ اورینٹل انسٹی ٹیوٹ تاشقند کے درمیان ایک معاہدہ ہوا ہے جس کے تحت علمی وادبی اور ثقافتی شعبوں میں دونوں ادارے تعاون کریں گے۔ اس معاہدے کو حکومت ہند اور ازبکستان کی حکومتوں کی حمایت اور تعاون حاصل ہے اور صدر ازبکستان کے حالیہ دورے کے دوران دہلی میں اس معاہدے پر دستخط ہوئے۔

معاہدے پر گفت وشنید کا آغاز ستمبر 2004 میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری اور ٹرسٹی پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کے ایک سیمینار میں شرکت کے سلسلے میں ازبکستان کے سفر کے موقعے پر ہوا۔ ڈاکٹر قمر رئیس کی مدد سے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اسٹیٹ اورینٹل انسٹی ٹیوٹ تاشقند کے ریکٹر سے گفتگو

کے بعد معاہدے کا مسودہ تیار کیا۔ پھر غالب انسٹی ٹیوٹ کی کوششوں اور ازبکستان کے سفارت خانے کے تعاون سے یہ معاہدہ مکمل ہوا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے پروفیسر نذیر احمد قائم مقام صدر غالب انسٹی ٹیوٹ اور ریکٹر اسٹیٹ اورینٹل انسٹی ٹیوٹ نے دستخط کیے۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے غالب کی تحریر کی ایک فوٹو کاپی صدر جمہوریہ ازبکستان کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کی جس میں غالب نے سمرقند سے اپنے دادا کے ہندوستان آنے کا ذکر کیا تھا۔ صدر جمہوریہ ازبکستان کو غالب کی کتابیں اور ان کے انگریزی تراجم بھی پیش کیے گئے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ازبک زبان میں دیوانِ غالب کا ترجمہ برسوں پہلے ازبک عالم عبدالرحمٰن یزدی نے شائع کرایا تھا۔ یہ کام انھوں نے اس وقت دہلی یونیورسٹی میں صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب کی مدد سے کیا تھا۔ (ڈاک سے)

## قاضی عبدالستار کو عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ

● نئی دہلی، 28/اپریل۔ قطر کے عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ کے لیے اس سال ہندوستان سے صاحبِ اسلوب نثر نگار قاضی عبدالستار اور پاکستان سے ممتاز ناول نویس ہاجرہ مسرور کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ایک لاکھ پچاس ہزار روپے نقد اور طلائی تمغے پر مشتمل یہ ایوارڈ دسمبر میں دوحہ قطر میں ایک تقریب میں پیش کیے جائیں گے۔ یہ ایوارڈ ہر سال ایک ہندوستانی اور ایک پاکستانی ادیب کو دیا جاتا ہے۔ ہندستان میں یہ ایوارڈ اب تک آل احمد سرور، قرۃ العین حیدر، سریندر پرکاش، جیلانی بانو، کالی داس گپتا رضا، جوگندر پال، گوپی چند نارنگ، صلاح الدین پرویز اور نثار احمد فاروقی کو دیا جا چکا ہے۔ پاکستان میں احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، انتظار حسین، بانو قدسیہ، محمد خالد اختر، شوکت صدیقی، مستنصر حسین تارڑ اور عبداللہ حسین یہ ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔

قاضی عبدالستار کے اب تک گیارہ ناول اور افسانوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ناول داراشکوہ، شب گزیدہ، غبارِ شب، بادل، غالب، حضرت جان، خالد بن ولید اور افسانوی مجموعہ پیتل کا گھنٹہ اور رضو باجی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ حال ہی میں ان کا نیا ناول ''تاجم سلطان'' شائع ہوا ہے۔ پروفیسر قاضی عبدالستار 1993 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے ریٹائر ہوئے۔

قاضی عبدالستار سیتاپور اتر پردیش کے ایک گاؤں میں 1933 میں پیدا ہوئے۔ ایم۔اے۔ تک کی تعلیم انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں حاصل کی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی۔ انھیں متعدد ادبی اعزازات حاصل ہو چکے ہیں۔ جن میں غالب ایوارڈ، میر ایوارڈ، اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ اور مہاراشٹر اکادمی ایوارڈ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ (قومی آواز، دہلی)

## پروفیسر گوپی چند نارنگ دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر ایمریٹس

● نئی دہلی، 12/مئی۔ دہلی یونیورسٹی کی ایگزیکیٹو کونسل نے اردو کے ممتاز ناقد و محقق اور ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ کو ان کی اعلیٰ ادبی و علمی خدمات کے اعتراف میں اپنے گراں قدر اعزاز ''پروفیسر ایمریٹس'' سے سرفراز کیا ہے۔ پروفیسر ایمریٹس اکادمک میدان کا اعلیٰ ترین اعزاز ہے جو کسی پروفیسر کو اس کی زندگی بھر کی بیش قیمت خدمات کے اعتراف میں دیا جاتا ہے۔ اردو میں دہلی یونیورسٹی نے اب تک یہ اعزاز صرف اس شعبے کے بانی پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کو عطا کیا تھا۔ دہلی یونیورسٹی نے اس بار پروفیسر گوپی چند نارنگ کے علاوہ سماجیات کے پروفیسر اندرے بیتل اور پرو وائس چانسلر پروفیسر سی.آر. بابو کو بھی پروفیسر ایمریٹس بنایا ہے۔

60 سے زیادہ کتابوں کے مصنف و مولف پروفیسر نارنگ کو حکومتِ ہند کی جانب سے ''پدم شری'' اور ''پدم بھوشن'' سے بھی سرفراز کیا جا چکا ہے۔ انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور غالب ایوارڈ کے علاوہ اندرا گاندھی فیلوشپ، قطر ادبی ایوارڈ اور دیگر متعدد ایوارڈ عطا کیے جا چکے ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز دہلی یونیورسٹی کے سینٹ اسٹیفنس کالج سے 1957 میں کیا۔ بعد میں 1958 میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لیکچرر اور 1961 میں ریڈر بنے۔ 1974 سے 1984 تک انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ اردو کے صدر اور پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس دوران میں وہ ویزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے وسکانسن یونیورسٹی میڈیسن، منی سوٹا یونیورسٹی مینا پلس (امریکہ) بھی گئے۔ پروفیسر نارنگ 1987 سے 1990 تک یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے نیشنل فیلو رہے ہیں اور 1986 میں وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ایک بار پھر دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر کی حیثیت سے آ گئے اور 1996 میں سبک دوش ہوئے۔ پروفیسر نارنگ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ڈین اور قائم مقام وائس چانسلر، قومی اردو کونسل میں نائب چیئرمین، ساہتیہ اکادمی میں نائب صدر رہ چکے ہیں۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ اور صدر شعبہ ڈاکٹر ابن کنول نے پروفیسر نارنگ کو اس اعزاز پر مبارکباد دی ہے۔ (ڈاک سے)

## مذاکرہ ''اردو افسانے کے نئے رجحانات''

● بھاگلپور، 31/مارچ۔ شعبۂ اردو ٹی.ایم. بھاگلپور یونیورسٹی میں بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے ''اردو افسانے کے نئے رجحانات'' کے موضوع پر ایک مذاکرے کا انعقاد ہوا جس میں فکشن کے کئی اہم ناقدین اور افسانہ نگاروں نے

شرکت کی۔ پروفیسر وہاب اشرفی، جناب محمود واحد، پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر عبدالواسع، پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر حسین الحق، جناب مشتاق احمد نوری، جناب شوکت حیات اور پروفیسر رئیس انور رئیس کے علاوہ مقامی اہل علم، پروفیسر قمرالتوحید، پروفیسر لطف الرحمٰن، جناب شاہ منظر حسین، پروفیسر آصف واسع، جناب شرجیل احمد خاں، پروفیسر شکیل احمد، ڈاکٹر مسعود احمد، ڈاکٹر جمشید حسن اور پروفیسر شمیم قمر نے اس مذاکرے میں شرکت کی۔ مذاکرے میں اردو افسانہ نگاری کے نئے محرکات، امکانات اور ان سماجی وتہذیبی عوامل پر کئی اہم مقالے پڑھے گئے جن سے موجودہ عہد کے افسانوں کا تانا بانا بنا جاتا ہے۔ اس موقعے پر نئی ادبی نسل کو درپیش نئے مسائل حیات کا تجزیہ کیا گیا سماجی وثقافتی زندگی میں تبدیلیوں کا جائزہ لیا گیا اور زبان وبیان اور لہجہ واظہار کے جدید تر رویے پر روشنی ڈالی گئی۔

منتظمین میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر قمر جہاں کے علاوہ شعبے کے دیگر اساتذہ ڈاکٹر محمد بدرالدین، ڈاکٹر محمد رضی احمد، ڈاکٹر مناظر حسن، ڈاکٹر ابوعبیدہ ابدالی اور ڈاکٹر محمد عزیزالرحمٰن شامل تھے۔ (ڈاک سے)

## جگن ناتھ آزاد کی یاد میں جلسہ

● حاجی پور، 2/اپریل۔ ''ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد علامہ اقبال کے پرستار تھے ان کی شاعری میں فکروفن کا جو امتزاج پایا جاتا ہے اسے انھوں نے علامہ اقبال سے سیکھا تھا۔'' ان خیالات کا اظہار اردو کے نامور ناقد اور انجمن ترقی اردو، بہار کے صدر ڈاکٹر عبدالمغنی نے انجمن ترقی اردو، ویشالی کی طرف سے منعقدہ جگن ناتھ آزاد سیمینار کے موقعے پر اپنی صدارتی تقریر میں کیا۔ ڈاکٹر عبدالمغنی نے کہا کہ ڈاکٹر آزاد نے ملک کی تقسیم کے بعد اپنے کلام کے ذریعے ہندوستان کے لٹے پٹے مسلمانوں کا حوصلہ بڑھایا اور انھیں سہارا دیا۔

خدابخش لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر امتیاز احمد نے کہا کہ جگن ناتھ آزاد کی شخصیت اور شاعری میں جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ہے ان کی انسان دوستی اور یہی خوبی ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ سیمینار کے مہمان خصوصی مگدھ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر علیم اللہ حالی تھے۔ سیمینار میں ڈاکٹر ریحان غنی، ڈاکٹر واحد نظیر، نذرالاسلام، انوارالحسن وسطوی، ڈاکٹر مشتاق احمد اور سید مصباح الدین احمد نے مقالے پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر ممتاز احمد خاں اور شکریہ انجمن کے سرپرست سید ابوصالح نے پیش کیا۔ (قومی آواز، دہلی)

## پروفیسر عقیل رضوی کے اعزاز میں تہنیتی جلسہ

● الٰہ آباد، 5/مارچ۔ مشہور ادیب وناقد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کو غالب ایوارڈ ملنے کی خوشی میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی جانب سے ایک تہنیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت الٰہ آباد یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر ٹی. پتی نے کی۔ اس موقعے پر سید محمد عقیل کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پروفیسر عبدالحامد نے کہا کہ عقیل صاحب کی شخصیت انعام واکرام سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ وہ ایک شریف النفس، بے نیاز قسم کے انسان ہیں، جن کا مطالعہ بہت ہی گہرا اور وسیع ہے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایچ.آر. سنگھ نے عقیل صاحب کو مبارک باد پیش کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ضمیر احسن نے ''رام چرت مانس'' کی گروندنا کا منظوم ترجمہ پیش کیا اور سید محمد عقیل کی علمی وادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔

الٰہ آباد یونیورسٹی کی ٹیچرس ایسوسی ایشن کے صدر ڈاکٹر رام کشور شاستری، شعبۂ انگریزی کے پروفیسر راج ناتھ سنگھ اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر کے.جی. شری واستو، پروفیسر عبدالقادر جعفری، پروفیسر فضل امام، راجستھان یونیورسٹی جے پور کے پروفیسر فیروز احمد اور پروفیسر عبدالحق نے پروفیسر عقیل رضوی کی حیات، شخصیت اور خدمات کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اسلم الٰہ آبادی، نایاب بلیاوی اور اختر عزیز وغیرہ نے منظوم تہنیتی نظمیں پڑھ کر سید محمد عقیل صاحب سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا۔ آخر میں پروفیسر سید محمد عقیل نے اپنے بارے میں بعض وضاحتیں کیں اور سامعین ومنتظمین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے جلسے کی نظامت کی۔ آخر میں پروفیسر عبدالحامد نے تمام سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

## جمنا داس اختر کے ساتھ ایک شام کا انعقاد

● نئی دہلی، 19/اپریل۔ اردو اکادمی، دہلی کی جانب سے غالب اکادمی میں بزرگ صحافی جمنا داس اختر کے ساتھ ایک شام کا انعقاد کیا گیا۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے اکادمی کے وائس چیئرمین م.افضل نے کہا کہ جمنا داس اختر کی صحافت کے معیار کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ میں نے ان کے مضامین اور تجزیے نہ صرف ہندوستان کے تمام بڑے اخبارات ورسائل میں دیکھے ہیں بلکہ ان کے مضامین پاکستان کا مقبول عام روزنامہ ''جنگ'' بھی پابندی سے شائع کرتا رہا ہے۔ اس موقعے پر پریم پال اشک نے اختر کی حیات وشخصیت اور پروانہ ردولوی نے ان کی صحافتی خدمات پر مضمون پیش کیا۔ جمنا داس اختر نے اپنی تقریر میں ان تمام حالات کا تفصیلی ذکر کیا جن کی وجہ سے وہ اردو صحافت کی طرف راغب ہوئے۔ انھوں نے تقسیم ملک کے دردناک واقعات اور خانماں بربادوں کی بازآبادکاری کا تفصیل سے ذکر کیا۔ پروگرام کے آغاز میں م.افضل اور سیمینار کمیٹی کے کنوینر شیخ منظور احمد نے جمنا داس اختر کو ایک شال اور پانچ ہزار اکیاون روپے بطور نذرانہ پیش کیے۔ آخر میں اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

## انیس کی یاد میں جلسہ

● حیدرآباد، 8/اپریل۔ امام خمینی پبلک لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر، نور خاں بازار، حیدرآباد کی طرف سے 24 صفرالمظفر کو بعد مجلس شہادت ثانی زہرا شہزادی زینب بنت علیؑ مراثی کی دنیا میں عالمگیر شخصیت کے حامل مرزا ببر علی انیس کی یاد میں ایک جلسہ زیر صدارت جناب میر ہادی علی آل انڈیا شیعہ مسلم پرسنل لا بورڈ منعقد ہوا جس میں مولانا سید ظفر یاب حیدر رضوی (پرنسپل حوزۃ المہدی، حیدرآباد)، مولانا سید صابر حسین عابدی (فاضل قم ایران)، پروفیسر سید عسکری حسن عابدی، جناب محمد خلیل الرحمان (سابق ایم پی) صدر نشین پی بی بی اقلیتی ڈیپارٹمنٹ، نواب سید شہر یار علی خاں نے انیس کے مرثیوں پر روشنی ڈالی۔ آخر میں جناب ارجن سنگھ، مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ جلد از جلد شہر حیدرآباد کو بھی قومی اردو کونسل میں نمائندگی دیں۔

(ڈاک سے)

## اقبال پر مذاکرہ

● اندور، 26/فروری۔ سنسکرتی وبھاگ مدھیہ پردیش ساہتیہ اکادمی اور علامہ اقبال ادبی مرکز، بھوپال کی جانب سے اقبال پر ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس میں مقامی سینیر ادیبوں ڈاکٹر عزیز اندوری، ڈاکٹر نریندر ورمنی اور جناب رشید اندوری شادانی کے علاوہ بھوپال سے جناب جھگانی ڈپٹی ڈائرکٹر ساہتیہ اکادمی، پروفیسر آفاق احمد اور جناب اقبال مسعود نے شرکت کی۔

اس جلسے میں جناب اقبال مسعود نے ''کلام اقبال میں ہندوستانی جمالیات'' ڈاکٹر نریندر ورمنی نے ''کلام اقبال کا نفسیاتی جائزہ'' جناب رشید اندوری نے ''عشق رسول اور اقبال'' اور ڈاکٹر عزیز اندوری نے ''خطوط اقبال'' کے زیر عنوان مقالے پیش کیے۔ جلسے کی صدارت پروفیسر آفاق احمد نے کی۔

(ڈاک سے)

## آغا حشر کاشمیری پر مذاکرہ

● وارانسی، 6/اپریل۔ آغا حشر اکادمی کی طرف سے آغا حشر کاشمیری کی 126 ویں سالگرہ پر ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر بھانوشنکر سنہا نے کہا کہ ہندوستانی شیکسپیئر آغا حشر کاشمیری نے ہندوستان میں فن ڈراما نگاری کو بلند مقام تک پہنچایا۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں سماج کی برائیوں کو خوب اُجاگر کیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی پروفیسر حنیف نقوی سابق صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی نے کہا کہ آغا جمیل کاشمیری مرحوم کی زندگی اور رہنمائی میں جو کام شروع ہوا تھا اسے ڈاکٹر یعقوب یاور نے بہت ہی لگن سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا جس کی بنا پر آغا حشر کے تمام ڈرامے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعے شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔

آغا حشر اکادمی کے جنرل سکریٹری آغا نہال نے آغا حشر کے ڈراموں پر نئے سرے سے بحث کی ضرورت پر زور دیا۔ جلسے میں ڈاکٹر یعقوب یاور اور ڈاکٹر نسیم احمد نے آغا حشر کے ڈراموں کے فنی محاسن بیان کیے۔ آخر میں اکادمی کے سکریٹری نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

## اردو ریسرچ اسکالر سیمینار

● نئی دہلی، 6/اپریل۔ ''اردو ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن'' کی طرف سے ایک سیمینار بہ عنوان ''اردو نثر 1857 تک'' ٹیگور ہال آرٹس آف فیکلٹی، دہلی یونیورسٹی میں منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر ابن کنول، پروفیسر صادق اور ڈاکٹر علی جاوید نے کی اور نظامت کا فریضہ محمد اکمل شاداب نے انجام دیا۔ سیمینار کا آغاز اردو ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن کی صدر محترمہ شبانہ آفریں کے استقبالیہ کلمات سے ہوا اور ایسوسی ایشن کے جوائنٹ سکریٹری عبدالرب نے تنظیم کی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔ اس موقعے پر تنویر احمد (جے این یو) اور ممتاز عالم (دہلی یونیورسٹی) نے بالترتیب ''فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات'' اور ''ہندوستانی تہذیب رانی کیتکی کی کہانی کے آئینے میں'' کے زیر عنوان مقالے پیش کیے۔ عمیر منظر، جاوید رحمانی، عاصم اکرم، شبنم ناز اور محمد ہادی رہبر نے بحث میں حصہ لیا۔ اس موقعے پر شعبہ اردو کے تمام اساتذہ اور دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے طلبہ نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ سیمینار کے اختتام پر محمد ہادی رہبر نے اظہار تشکر کیا۔

(ڈاک سے)

## اردو یونیورسٹی میں قومی یوم سائنس پر خطبہ

● حیدرآباد، 7/مارچ۔ دکن کالج آف میڈیکل سائنسز اور متعلقہ اسپتالوں و نیم طبی اداروں کے ڈائرکٹر پدم شری ڈاکٹر سی ایم حبیب اللہ نے کہا کہ انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی میں بے شمار بیش قیمت اور نایاب قسم کی کتابوں کو دیکھا ہے جو وہاں بڑی مشکل سے تیار کی گئی تھیں مگر ان کا کوئی استعمال کرنے والا نہیں تھا۔ دراصل یہ یونیورسٹی سطح پر اردو میڈیم تعلیم کے زوال کا شاخسانہ تھا مگر اب مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام کے بعد ایک بار پھر سے یہ امید بندھی ہے کہ اعلا سطح پر اردو تدریس کے لیے کتابیں تیار ہوں گی اور اردو میں علمی کتابوں کی افادیت پھر سے تسلیم کی جائے گی۔ انھوں نے ان خیالات کا اظہار اردو یونیورسٹی میں فاؤنڈیشن لیکچر سیریز کے تحت قومی یوم سائنس پر خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ واضح رہے کہ اردو یونیورسٹی نے فاؤنڈیشن خطبات کے انعقاد کا فیصلہ کیا ہے جن میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کی یاد میں ٹیچرس ڈے لیکچر، مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں ایجوکیشن ڈے

لیکچر، اسد اللہ خاں غالب کی یاد میں یوم غالب لیکچر اور بھارت رتن سی وی رمن کی یاد میں نیشنل سائنس ڈے لیکچر خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس کا مقصد مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی ممتاز و معروف شخصیتوں کے عالمانہ خیالات اور تجربات سے طلبہ، اساتذہ اور دیگر لوگوں کو استفادے کا موقع فراہم کرنا ہے۔ مذکورہ قومی یوم سائنس لیکچر اس سلسلے کا افتتاحی لیکچر تھا جس کا موضوع "Stem Cells for Future Regenerative Medicine" تھا۔

وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان نے اس تقریب کی صدارت کی اور خطبۂ استقبالیہ بھی پیش کیا۔ رجسٹرار جناب فاروق احمد نے شکریہ ادا کیا۔ ریڈر ٹرانسلیشن ڈویژن ڈاکٹر محمد ظفر الدین نے تقریب کی نظامت کی۔

(ڈاک سے)

## ''بیرسٹر اقبال لیگل اسٹڈی چیمبر'' کا افتتاح

● کالی کٹ، 30 اپریل۔ کیرالا میں علامہ اقبال کے فکر اور فلسفے سے عام لوگوں کو روشناس کرانے کے لیے عبدالصمد صمدانی (ممبر پارلیمنٹ) کے قائم کردہ علامہ اقبال انڈین ہیومنٹیرین فاؤنڈیشن کے تحت بیرسٹر اقبال لیگل اسٹڈی چیمبر قائم کیا گیا ہے۔ 23 اپریل کی شام اس کا افتتاح جناب کپل سبل مرکزی وزیر برائے سائنس اور ٹیکنالوجی نے کیا۔

استقبالیہ خطبے میں جناب عبدالصمد صمدانی نے ادارے کے کارناموں کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ اس موقعے پر وزیر موصوف نے کہا کہ علامہ اقبال نے ایک عام ہندوستانی کی زندگی گزاری۔ انھوں نے وطن سے بے لوث محبت اور آپسی بھائی چارے کی راہ پر چلنے کا سبق پڑھایا۔ اس جلسے کی صدارت کیرالا ہائی کورٹ کے جسٹس عالی جناب کے. عبدالغفور تے کی۔ تقریب کے اختتام پر طالبات کی جانب سے اقبال کا ترانہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' پیش کیا گیا۔ (ڈاک سے)

## اردو یونیورسٹی میں یکم مئی سے داخلوں کا آغاز

● حیدرآباد، 23 اپریل۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے فاصلاتی اور کیمپس طریقۂ تعلیم کے تحت مختلف کورسوں میں نئے تعلیمی سال کے لیے داخلے کی کارروائی کا آغاز یکم مئی سے ہو رہا ہے۔ یونیورسٹی نے فاصلاتی طریقۂ تعلیم سے ایم.اے. (اردو)، ایم.اے. تاریخ، تین سالہ ڈگری کورسوں بی.اے.، بی.ایس.سی. اور بی.کام، ایک سالہ ڈپلوما ان ٹیچ انگلش کے علاوہ پانچ چھ ماہی سرٹیفکیٹ کورسوں غذا و تغذیہ، اہلیت اردو بذریعہ ہندی اور بذریعہ انگریزی، فنکشنل انگلش اور کمپیوٹنگ میں داخلے کا اعلان کیا ہے جس کے لیے مشترکہ پراسپکٹس مع درخواست فارم ہیڈ صدر دفتر اور ملک کے مختلف علاقوں میں واقع اس کے پانچ ریجنل سینٹروں اور اسٹڈی سینٹروں پر یکم مئی سے دستیاب رہیں گے۔ بی.اے./ بی.ایس.سی./ بی.کام سال اول (بنیادی کورس) میں دو طرح سے داخلے دیے جاتے ہیں۔ جو طلبہ بارھویں جماعت یا اس کے مساوی کوئی منظور شدہ کورس کامیاب کر چکے ہیں وہ راست داخلہ حاصل کر سکتے ہیں اور جو طلبہ کامیاب نہیں ہوئے ہیں انھیں اہلیتی ٹسٹ میں کامیابی حاصل کرنی ہوتی ہے۔ اہلیتی ٹسٹ کا انعقاد 3 جولائی 2005 بروز اتوار منعقد ہوگا جس کے لیے فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ 15 جون 2005 ہے۔ اہلیتی جانچ کے علاوہ بھی کورسوں کے لیے درخواست وصول ہونے کی آخری تاریخ 30 ستمبر 2005 ہے۔ پراسپکٹس مع درخواست فارم شخصی طور پر -/45 روپے یا بذریعہ ڈاک -/60 روپے کے بینک ڈرافٹ کے عوض حاصل کیا جا سکتا ہے۔

داخلہ فارم، پراسپکٹس اور دیگر تمام تفصیلات یونیورسٹی ویب سائٹ (www.manuu.ac.in) سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ کسی بھی پراسپکٹس مع درخواست فارم کے لیے نقد رقم قبول نہیں کی جائے گی۔ (ڈاک سے)

## مالیر کوٹلہ میں کمپیوٹر سینٹر کا قیام جلد

● مالیر کوٹلہ۔ گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج کی بزم ادب کی جانب سے سالانہ ادبی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ اس تقریب میں اردو طلبہ، اساتذہ، مختلف ادبی تنظیموں کے ذمے داران اور محبان اردو نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر محمد اقبال نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کا تعارف کراتے ہوئے مختلف سطحوں پر انکی اعلیٰ خدمات اور انتظامی صلاحیتوں کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کی رہنمائی میں قومی اردو کونسل ترقی کی نئی منازل طے کر رہی ہے اور کونسل کی جانب سے اردو کو عصری تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا عمل جاری ہے۔ انھوں نے پنجاب میں اردو کے فروغ کے لیے مختلف اقدامات اٹھانے کے لیے بھی کونسل کے ڈائرکٹر سے درخواست کی۔

اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے اردو کے معیار تعلیم کو بلند کرنے پر زور دیتے ہوئے اسے دور حاضر سے ہم آہنگ کرنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے اردو کی تہذیبی اور تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو ہمارے ورثے اور تمدن کی زبان ہے اسی لیے یہ آج زندہ اور مقبول ہے۔ انھوں نے مالیر کوٹلہ کالج کے شعبۂ اردو میں ایک کمپیوٹر سینٹر کے قیام اور مستقبل قریب میں سہ روزہ اردو سیمینار کے انعقاد کا بھی اعلان کیا۔ انھوں نے شعبۂ اردو کی جانب سے فروغ اردو کے لیے کی جارہی کوششوں کی ستائش کی اور یقین دلایا کہ کونسل شعبۂ اردو کے فروغ و ترقی کے لیے ہر ممکن تعاون دے گی۔

اس موقعے پر پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کے ڈپارٹمنٹ آف ایوننگ اسٹڈیز کی صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر ریحانہ پروین نے شفیق الرحمن کی طنز و مزاح نگاری پر مقالہ پیش کیا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ترسیم دھاریوال نے مہمانان و حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہندی ادب میں طنز و مزاح کی روایت پر مختصراً روشنی ڈالی۔ شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر منظور حسن نے تقریب کی نظامت کی۔ (ڈاک سے)

## فرید کوٹ اردو اسٹڈی سینٹر میں کنٹیکٹ کلاس کا آغاز

● مالیر کوٹلہ، 3 اپریل۔ اردو زبان کے فروغ کے لیے قومی اردو کونسل کی جانب سے فاصلاتی ذریعۂ تعلیم پروگرام کے تحت پورے ملک میں بڑے پیمانے پر اردو اسٹڈی سینٹر قائم کیے گئے ہیں۔ اردو زبان اور رسم خط سکھانے کے لیے ''ڈپلوما ان اردو لینگویج'' کورس سینچری پبلک اسکول، مالیر کوٹلہ، پنجاب میں شروع کیا گیا ہے۔ اس کورس کو مزید موثر اور دل چسپ بنانے کے لیے اسٹڈی سینٹر کی طرف سے مہاتما گاندھی میموریل اسکول، فرید کوٹ میں آن ڈور سروس مہیا کی گئی جس میں فیروز پور، موگہ، بھٹنڈہ اور فرید کوٹ اضلاع کے طلبہ نے شرکت کی۔ مذکورہ بالا کورس میں زیادہ تر پنجاب کے اعلا پولیس افسران، جج، وکلا، اسکول اور کالج کے اساتذہ اور نوجوان طلبہ نے داخلہ لیا ہے۔ جس میں 95% طلبہ کا تعلق سکھ، ہندو اور عیسائی مذہب سے ہے۔

کلاس میں ماہر تعلیم ایم شفیق نے طلبہ کو آسان اور نہایت دل چسپ انداز میں اردو رسم خط لکھنے اور پڑھنے کا طریقہ سمجھایا اور ان کے شکوک و شبہات دور کیے۔ اس موقعے پر شرکا نے یہ کورس شروع کرنے کے لیے مرکزی حکومت خصوصاً مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ کو مبارک باد دی۔

(ڈاک سے)

## اردو تہذیب ڈاٹ کام کا افتتاح

● نئی دہلی، 21 اپریل۔ '' میں اردو سے بہت عشق کرتا ہوں، اس کا مزہ لیتا ہوں، یہ زبان یہیں پیدا ہوئی، پلی بڑھی اور یہی آج روزمرہ کی زبان ہے۔'' اس خیال کا اظہار مشہور نغمہ نگار، فلم ساز اور شاعر گلزار نے ایک تقریب میں شمع جلاکر ''اردو تہذیب ڈاٹ کام'' (www.urdutahzeeb.com) کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج ہندی فلموں کی 70 فیصد زبان اردو ہی ہوتی ہے۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے احمد فراز نے کہا کہ چونکہ اردو نسبتاً جدید زبان ہے اس لیے اس کے ذخیرۂ الفاظ میں کمی کا احساس ہوتا ہے اور کبھی کبھی خیالات کے اظہار کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ امید ہے کہ اس طرح کی کوششیں اردو لفظیات کو وسیع اور مالا مال کرنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔ پنجابیوں کی عالمی ثقافتی تنظیم پنجابی ملینیم کی طرف سے شروع ہونے والی اس ویب سائٹ کا خاص مقصد ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و ثقافت جسے گنگا جمنی تہذیب بھی کہتے ہیں کو فروغ دینا اور اسے ساری دنیا میں مقبول بنانا ہے۔ یہ ویب سائٹ علم و ادب کے سارے گوشوں کو سمیٹنے کی کوشش کر رہی ہے اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس جدید دور میں اردو کو جدید تبدیلیوں سے روشناس کرنے میں سرگرم ہے۔ یہ ویب سائٹ قاری کو حالات حاضرہ سے باخبر رکھتی ہے اور مستقل طور پر ہندوستان اور دنیا کے حالات کی تازہ ترین تصویر پیش کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ (قومی آواز، دہلی)

## نیشنل اینگلو اردو ہائی اسکول
## پمپری چنچوڑ، کے طلبہ کی شاندار کامیابی

● اردو کونسل پمپری چنچوڑ ''نیشنل اینگلو اردو ہائی اسکول'' کے طلبہ و طالبات نے سرٹیفکیٹ ان انفارمیشن ٹیکنالوجی (اسکول سطح) کے امتحان میں شاندار امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے۔

کل 84 طلبہ نے انفارمیشن ٹیکنالوجی امتحان میں حصہ لیا۔ ہشتم جماعت میں چودھری شائستہ محمد ایش، انعامدار جبین حقانی، شیخ نازنین ادریس کو امتیازی نمبرات اور شیخ فرحت فاطمہ، منیر انصاری عائشہ مسعود کو درجہ اول اور نہم جماعت میں صابرین محمد وسیمی، صدیقی ناہید عابد علی، قریشی صبیحہ محمد اکرم، صدیقی ناہید قیوم کو امتیازی نمبرات سے اور زبیری توفیق قاسم، شیخ سہیل سلیم، شیخ صنوبر ایوب کو درجۂ اوّل اور دہم جماعت میں شیخ نازنین نثار، شیخ شاہین غزالہ محمد رفیق نے امتیازی نمبرات اور بقیہ طلبہ نے نمایاں طور پر کامیابی حاصل کی ہے۔ اردو کے ان طلبہ نے انفارمیشن ٹیکنالوجی کورس کے لاکھوں طالب علموں میں اوّل مقام حاصل کیا ہے جو مہاراشٹر کے اردو اسکولوں کا ایک نیا ریکارڈ ہے۔ (ڈاک سے)

## مختصرات

● کشن گنج، یکم فروری۔ کشن گنج (بہار) میں قومی اردو کونسل کی طرف سے چلائے جا رہے ''کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر'' انجمن اسلامیہ ملت گرلس ہائی اسکول، کشن گنج سے ایک سالہ کمپیوٹر کورس کے فارغ طلبہ کے لیے جلسۂ تقسیم اسناد منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر سینٹر سے 2003-04 میں کامیاب طلبہ کو کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی۔ٹی۔پی۔ سرٹیفکیٹ دیا گیا۔ لڑکیوں کے زمرے میں شہلا تبسم اور لڑکوں کے زمرے میں انکیتو ساگر کو پہلا مقام حاصل ہوا۔ اس موقعے پر فیکلٹی کے دونوں ممبران جناب افتخار حسین ہدایت اللہ اور جناب جمال سعید کو بھی اعزازات سے نوازا گیا۔ جلسے میں سینٹر انچارج شہاب الدین خاں نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا۔

جناب زاہد الرحمٰن (نائب صدر، انجمن اسلامیہ وقف اسٹیٹ، کشن گنج) نے طلبہ کو اسناد عطا کیے۔ (ڈاک سے)

● ملاپورم، 13/اپریل۔ جنوبی ہند میں کیرالا واحد ریاست ہے جہاں اردو اکادمی نہیں ہے۔ اس کے لیے کیرالا اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن نے حکومت سے اردو اکادمی قائم کرنے کی درخواست کی ہے۔ اس سلسلے میں وزیر تعلیم جناب ای.ٹی. محمد بشیر نے ایک میٹنگ بلائی جس میں کیرالا اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن اور انجمن ترقی اردو کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس موقعے پر وزیر تعلیم نے پروجیکٹ رپورٹ تیار کرنے کے لیے سہ رکنی ٹاسک فورس تشکیل دی۔ اس کے کنوینر جناب ایم سلیمان مولوی صدر کیرالا اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن، جناب نی محمد اور ایس.سی.ای.آر.ٹی. کے اردو ریسرچ آفیسر ہیں۔ اس میٹنگ میں احمد کٹی کلاتل، کے شوکت علی، کے عبدالرحمٰن کٹی اور کے. پی شمس الدین ترورکاڈ نے حصہ لیا۔ (ڈاک سے)

● ممبئی۔ اعتراف گروپ، جنوادی لیکھک سنگھ اور سہ ماہی جریدہ ''نیاورق''، ممبئی کی جانب سے گذشتہ دنوں افسانہ نگار سلام بن رزاق کو ان کے افسانوی مجموعے ''شکستہ بتوں کے درمیان'' پر ساہتیہ اکادمی انعام ملنے پر ایک تہنیتی نشست کا انعقاد پریس کلب، ممبئی کے آڈیٹوریم میں کیا گیا جس کی صدارت فلم ساز وادیب ساگر سرحدی نے کی۔ ساجد رشید نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس نشست میں ہندی، اردو اور مراٹھی کے اہم ادیبوں، یعقوب راہی، محمود ایوبی، پرکاش بھاتمبریکر، وجے کمار، انور قمر، مقدر حمید، رام پنڈت، وقار قادری اور رام ساگر پانڈے نے سلام بن رزاق کے فن اور شخصیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

(ڈاک سے)

● سیتاپور، ادبی تنظیم ''بزم اردو سیتاپور'' کا جلسہ مسلم جونیر ہائی اسکول کے اردو ہال میں ہوا جس کی صدارت مست حفیظ رحمانی نے کی۔ جلسے میں معروف محقق، نقاد، شاعر وادیب جناب شمس الرحمٰن فاروقی کو قومی اردو کونسل کا وائس چیئرمین بنائے جانے اور کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کو ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل ایوارڈ ملنے پر مسرت کا اظہار کیا گیا۔ اس موقعے پر رضوان خاں، اشتیاق علی صبا، مظہر یٰسین، عمران سیتاپوری، عارف سیتاپوری، بابو صادق علی اور ابوالمجاہد انصاری نے بھی اظہار خیال کیا۔ (ڈاک سے)

● نئی دہلی، 8/اپریل۔ دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین جناب م. افضل نے ریلوے وزیر شری لالو پرساد یادو سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ریلوے وزارت کی جانب سے جاری کیے جانے والے اشتہارات کے سلسلے میں اردو اخباروں کے ساتھ ہو رہی ناانصافی کو دور کریں اور اردو اخبارات کو بھی اشتہارات جاری کریں۔ انھوں نے وزیر موصوف سے درخواست کی ہے کہ وہ ریلوے کی جانب سے جاری کیے جانے والے اشتہارات کے بارے میں ایک ایسی پالیسی وضع کریں جس سے سب کو مساوی طور پر انصاف مل سکے۔

(ڈاک سے)

● بھوپال۔ بھوپال کی ادبی اور ثقافتی تنظیم ''کہکشان ادب'' کی طرف سے گذشتہ دنوں مشاعرہ اور کوی سمیلن منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر شاعر جناب نجیب رامش اور بچوں کے شاعر احد پرکاش کا اعزاز واستقبال کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے معروف شاعر عشرت قادری نے کہا کہ کہکشان ادب نے بھوپال کی ادبی فضا پر طاری طویل جمود کو توڑا ہے اور اردو ہندی کے ادیبوں اور شاعروں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا ہے۔ مشاعرے اور کوی سمیلن کی نظامت نصیر پرواز اور بدر واسطی نے کی۔ اس میں جناب بشر صہبائی، نجیب رامش، احد پرکاش، تاج الدین تاج، ذوقی بھوپال، کیلاش گرو سوامی، نعیم صبا، سعید اختر، احمد امین اشرف، بیباک بھوپالی، چندر بھان راہی، اقتدار افسر، اختر وارثی، ثمر اسماعیل گردش، ڈاکٹر دیوریا انمیش، راہی بھوجپوری، شریمتی کسم پراشر اور ملک نوید نے اپنے کلام سے نوازا۔ (ڈاک سے)

● اردو اور فارسی کے ادیب ودانشور اور معروف محقق ڈاکٹر سید عبدالرحیم کی رحلت پر ادبستان کی جانب سے ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں انجمن کے اراکین ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن، ڈاکٹر محمد اسد اللہ اور مجیب صدیقی نے مرحوم کی شخصیت اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر منشاء الرحمٰن منشا نے اس جلسے کی صدارت کی اور ادارۂ حلقہ احباب کی جانب سے خراج عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر خواجہ ربانی نے اس جلسے کی نظامت کی۔ (ڈاک سے)

● پپری چنچوڑ اردو کونسل کے زیر اہتمام نیشنل اینگلو اردو ہائی اسکول کے اٹھائیس طلبہ اور طالبات لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا سے -/1200 روپے سالانہ اسکالرشپ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کل اٹھائیس طلبہ کے لیے -/33,600 روپے کی اسکالرشپ موصول ہوئی ہے۔

(ڈاک سے)

## مشاعرے

● نئی دہلی، 2/مئی۔ سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی یاد میں گذشتہ شب جامعہ نگر میں ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت سابق گورنر خورشید عالم خاں نے کی، جبکہ دہلی کی وزیر اعلیٰ شیلا دکشت نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ اس موقعے پر مہمان ذی وقار اتر پردیش کانگریس کے موجودہ صدر سلمان خورشید، سابق ریاستی وزیر اشوک یادو اور ڈاکٹر سید فاروق سمیت مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی سرکردہ شخصیات بھی موجود تھیں۔ اس موقعے پر معروف شاعر راحت اندوری، منور رانا اور قیصر الجعفری کو ادبی خدمات

اور عزیز برنی کو صحافتی خدمات کے لیے مشاعرے کے منتظمین کی جانب سے وزیرِ اعلیٰ شیلا دیکشت کے ہاتھوں ایوارڈ بھی پیش کیے گئے۔ آخر میں مشاعرے کے کنوینر آصف محمد خاں کونسلر، اوکھلا نے سبھی مہمانانِ شعرائے کرام، سامعین اور انتظامیہ کو مبارکباد پیش کی۔ مشاعرے کے آغاز میں نظامت اعجاز انصاری نے اور بعد میں منصور عثمانی نے کی۔ اس میں قیصر الجعفری، منوّر رانا، ڈاکٹر راحت اندوری، احمد کمال پروازی، ساحل سحری، جاوید عرشی، ڈاکٹر نسیم نکہت، حق کانپوری، اعجاز انصاری، قیس رامپوری، معین شاداب، راشد حامدی، ترنم کانپوری، ڈاکٹر ضیا رانا، الطاف ضیا، خوشبو شرما، ساغر خیامی، اعجاز، پاپولر، خورشید حیدر، زخمی میرٹھی، مکیش درپن، ممتاز نسیم، ریاض ساغر اور ضمیر سلیمی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● سہارنپور، 15 را پریل۔ ممتاز شاعر احمد فراز نے جشنِ سہارنپور کے تحت ہند و پاک مشاعرے میں شرکت کی، جس کا انعقاد سنسکار ندھی نے کیا تھا۔ احمد فراز نے ہندوستان اور پاکستان میں منعقد ہونے والے ہند و پاک مشاعروں کو دونوں ممالک کے تعلقات کے درمیان ایک مضبوط کڑی قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ جب جب ہندوستان آئے ہیں یہاں ان کو بھرپور محبتیں اور چاہتیں ملی ہیں اور وہ دونوں طرف سے محبتوں کا پیغام لاتے اور لے جاتے رہے ہیں۔ انھوں نے مشاعرے میں اپنی مشہور نظم ''ہند و پاک دوستی کے نام'' پیش کی۔ مہمان خصوصی ریاستی وزیر کوکب حمید و سنجے گرگ اور عمران مسعود نے مشترکہ طور پر مشاعرے کی شمع روشن کی۔ سماج وادی پارٹی کے زونل انچارج راج کمار یادو نے مشاعرے کی صدارت کی اور انور جلال پوری نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ مشاعرے کے کنوینر منصور بدر نے شعرا کا استقبال کیا۔ اس مشاعرے میں جن شعرائے کرام نے اپنے کلام سے نوازا ان میں وسیم بریلوی، منوّر رانا، راحت اندوری، معراج فیض آبادی، ڈاکٹر نسیم نکہت، انور جلال پوری، جوہر کانپوری، الطاف ضیا، ماجد دیوبندی، شبینہ ادیب، ترنم کانپوری، منیش شکلا لکھنوی، خالد زاہد اور سکندر حیات گڑبڑ کا نام شامل ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

**رسمِ اجرا**

## تاج سلطان

● علی گڑھ، 25 را پریل۔ ممتاز ناول نگار قاضی عبدالستار نے اپنے نئے ناول ''تاج سلطان'' کے اجرا کے موقعے پر کہا کہ معاشرے کو دیکھنے پرکھنے اور اپنے چاروں طرف کرداروں کو سمجھنے اور ان کا جائزہ لینے کی سمجھ ہی کسی بھی ادیب کی ناقابلِ فراموش دولت ہے۔ ادیب کی دوررس نظر ہی اس کی رہنما ہوتی ہے۔ یہ پروگرام جنوادی لیکھک سنگھ کے زیر اہتمام منعقد ہوا جس میں سنگھ کی سکریٹری نمیتا سنگھ نے قاضی عبدالستار کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ قاضی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تاریخ کا وسیع علم رکھتے ہیں اور ان کی ماضی کی کہانیوں میں حال جھلکتا نظر آتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ قاضی صاحب کی تخلیقات دارا شکوہ، شب گزیدہ، غبارِ شب، خالد بن ولید، بادل، باجی اور پیتل کا گھنٹہ ہندی اردو ادب کی بیش قیمت وراثت ہیں۔ اس تقریب کی نظامت کرتے ہوئے ممتاز ادیب طارق چھتاری نے کہا کہ قاضی عبدالستار کو نہ صرف تاریخی بلکہ معاشرتی ناول نگاری پر بھی قدرت حاصل ہے۔

سریش کمار نے تاج سلطان کے مکمل ہونے کے بعد مصنف سے ہوئی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ ناول ایک افسوس ناک ادھوری پریم کہانی ہے جسے مصنف نے ہر پل جیا ہے۔ حکیم ظل الرحمٰن نے بھی اس موقعے پر قاضی صاحب کے فن اور شخصیت پر اظہار خیال کیا۔ جنوادی لیکھک سنگھ کے نائب صدر و نقاد پروفیسر کنور پال سنگھ نے کہا کہ قاضی عبدالستار اپنی تحریروں میں اودھ کی مشترکہ تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں جو حقیقت میں ہندوستان کی تہذیب ہے۔ ناول کا اجرا کنور پال سنگھ، اطہر صدیقی اور شہریار نے مشترکہ طور پر کیا۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

## مجتبیٰ حسین...ایسا کہاں سے لاؤں

● ممبئی، 10 رمارچ۔ ممبئی یونیورسٹی میں ڈاکٹر شفیع شیخ کی کتاب ''مجتبیٰ حسین...ایسا کہاں سے لاؤں'' کی رسمِ اجرا مشہور طنز و مزاح نگار جناب یوسف ناظم نے انجام دی۔ اس موقعے پر جناب مجتبیٰ حسین بھی موجود تھے۔ ان کی ادبی خدمات پر انھیں ممبئی لٹریری اینڈ کلچرل سوسائٹی کی جانب سے ایک سپاس نامہ اور چاندی کی ٹرافی پیش کی گئی۔ اس پروگرام کی نظامت جناب فیاض احمد فیضی اور ڈاکٹر قاسم امام نے کی۔ تقریب میں مشہور فلم ساز جناب ساگر سرحدی نے اپنی تقریر میں مجتبیٰ حسین سے اپنے دیرینہ تعلقات کا بڑے خلوص سے ذکر کیا۔

جلسے میں پروفیسر محسن عثمانی، ڈاکٹر عرفان فقیہہ، پروفیسر ظہیر علی اور عبدالاحد ساز نے اس کتاب کے محاسن پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر مجتبیٰ حسین نے اپنا مضمون ''ویسا کہاں سے لاؤں کہ مجھ سا کہیں جسے'' سنایا۔ یوسف ناظم نے اپنی صدارتی تقریر میں مجتبیٰ حسین کے فن کی تعریف کی اور کتاب کے منفرد انداز تنقید کو سراہا جو ایک افسانوی فضا میں ظرافتی زبان میں لکھی گئی ہے۔ (ڈاک سے)

## سائنس اور کائنات

● علی گڑھ، 16 را پریل۔ سائنس اور کائنات سوسائٹی آف انڈیا نے اردو زبان میں ایک سائنسی، صحتی و ماحولیاتی ماہانہ اخبار ''سائنس اور کائنات'' کی اشاعت شروع کی ہے۔ اس میکینکل کے پہلے شمارے کی رسمِ اجرا کی تقریب

یونیورسٹی بوائز پالی ٹکنک کے اسمبلی ہال میں منعقد کی گئی اور اجرا جناب چودھری دھیندر سنگھ (ممبر پارلیمنٹ، علی گڑھ)، پروفیسر عبدالمعین (سابق چیئرمین شعبۂ میکینکل انجینئرنگ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ) اور ڈاکٹر ایس ایس نقوی (سائنسداں ڈپارٹمنٹ آف اوشین ڈولپمنٹ (حکومتِ ہند، نئی دہلی) کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ ابتدا میں سائنس اور کائنات سوسائٹی آف انڈیا کے جنرل سکریٹری خواجہ محمد رفیع نے تنظیم کا تعارف کراتے ہوئے اس کے بنیادی مقاصد پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر زاہد علی نے بھی اظہار خیال کیا۔

مہمانِ خصوصی چودھری دھیندر سنگھ نے اس موقعے پر کہا کہ ''سائنس اور کائنات'' سوسائٹی سائنس صحت و ماحولیات کو فروغ دینے کے لیے دیہی علاقوں میں جو کام کررہی ہے وہ بہت اہم ہے اور اس کام میں سب کو حصہ لینا چاہیے۔ پروفیسر عبدالمعین، ڈاکٹر ایس ایس نقوی، ڈاکٹر شکیل صمدانی اور جناب ارشد غازی نے بھی اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخری جلسے میں مدیر اخبار اسعد فیض فاروقی، نواب جاوید سعید چھتاری، پروفیسر ایس ایم یحییٰ، ڈاکٹر صلاح الدین عمری، ڈاکٹر سعود علی خان، ڈاکٹر سید ضیاء الرحمٰن، محترمہ غوثیہ دانش، جناب دانش، جناب ندیم غفور، ڈاکٹر مدثر علی، احمد مصطفےٰ، ضیا احمد خاں، رضیہ دانش، جاوید انور، عبدالمنان عتیق، محمد اکرم، خواجہ محمد فہیم اور بڑی تعداد میں اساتذہ اور طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر مرسلین نصیر نے کی۔

(ڈاک سے)

## منزل ہے کہاں تیری

● لندن، 5 فروری۔ اسلامک کلچرل سوسائٹی آف ہیرو اور یو.کے. پاکستان کلچرل فاؤنڈیشن کی طرف سے جناب توصل حسین صدیقی کی آپ بیتی ''منزل ہے کہاں تیری'' کا اجرا جناب احمد شہزاد نے کیا۔ اس موقعے پر لندن کی معروف ادبی شخصیتوں، دانشوروں اور زبان و ادب کے شیدائیوں نے شرکت کی جن میں جناب ڈاکٹر جاوید شیخ، ڈاکٹر مسعود فاروقی، جناب امداد علی، جناب محمد رضوی قابلِ ذکر ہیں۔

اس جلسے کی نظامت مشہور شاعر اور ماہر تعلیم جناب عقیل دانش نے کی اور جناب توصل حسین صدیقی نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

## چنار کے نیچے

● پنجم، 28 مارچ۔ دیپک بدکی کے دوسرے افسانوی مجموعے ''چنار کے نیچے'' کی رسم اجرا پنجم گوا میں منعقد ہوئی۔ دیپک بدکی پی ایم جی، گوا کے عہدے پر فائز ہیں اور ان کے افسانے مختلف رسائل و جرائد میں چھپتے رہتے ہیں۔ یہ مجموعہ انٹرنیشنل پبلی کیشنز، دریا گنج، دہلی نے شائع کیا ہے۔ (ڈاک سے)

## پیش رفت

● دہلی ادارۂ ادب اسلامی ہند کی طرف سے دفتر ماہنامہ ''پیش رفت'' بارہ دری، بلیماران دہلی میں ''عزیز بگھروی'' نمبر کی رسم اجرا مشہور شاعر جناب قیصر الجعفری کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے عزیز بگھروی سے اپنے دیرینہ تعلق کا ذکر کیا۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ اداروں کو اپنے فن کاروں کو جائز استحقاق دینے کے لیے کمربستہ رہنا چاہیے۔ میں عزیز صاحب کی علمی خدمات کا معترف ہوں۔ ادارۂ ادب اسلامی کے رکن جناب محمد فاروق خاں فراز سلطانپوری نے عزیز بگھروی کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنی شاعری کو بھٹکنے نہیں دیا۔ انھوں نے اپنے کردار کو ایک نمونہ بنا کر پیش کیا جو تعمیری اور اعلا مقاصد سے آراستہ تھا۔ اس موقعے پر جناب محسن شمسی اور ڈاکٹر عبید الرحمٰن نے بھی عزیز بگھروی کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالی۔ جناب قیصر الجعفری نے نظم ''عزیز بگھروی کی یاد میں'' جناب شفیق دہلوی نے نظم ''نذرِ عقیدت عزیز'' اور جناب وقار کیفی نے نظم ''چلا گیا'' پیش کی۔ اس موقعے پر ایک شعری نشست بھی منعقد کی گئی جس میں انتظار نعیم، قیصر الجعفری، احمد بگھروی، قمر سنبھلی، انتظار نعیم، ڈاکٹر ظفر مرادآبادی، جناب فراز سلطانپوری، ڈاکٹر عبید الرحمٰن، مخدوم زادہ مختار عثمانی اور وقار کیفی نے کلام پیش کیا۔ آخر میں جناب انتظار نعیم نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

**جانے والوں کی یاد**

## قاضی سلیم

● نئی دہلی، 8 مئی۔ ممتاز اردو شاعر اور دانشور قاضی سلیم کا سات مئی 2005 کو اورنگ آباد میں انتقال ہوگیا۔ وہ 76 برس کے تھے۔ پسماندگان میں بیوی اور ایک بیٹی ہے۔ یہ اطلاع ان کے دیرینہ رفیق مجتبیٰ حسین نے دی ہے۔ مرحوم پیشے سے وکیل تھے اور تقریباً پندرہ برس سے گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ انھیں 1980 میں اورنگ آباد حلقے سے لوک سبھا کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ وہ دس سال تک مہاراشٹر کی مجلسِ قانون ساز کے رکن بھی رہے اور مہاراشٹر اردو اکادمی سے بھی ان کا تعلق رہا۔

1968 میں قاضی سلیم کا پہلا مجموعہ ''نجات سے پہلے'' شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کی ایک مثنوی شائع ہوئی جو ان کے کلیات ''رسنگاری'' میں شامل ہے۔

ان کی وفات پر تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس نے کہا ہے کہ مرحوم اردو شاعری کے رجحانات سے کبھی مطمئن نہیں رہے۔ وہ شاعری میں نئے

تصورات اور خیالات کی ترجمانی چاہتے تھے اور عمر بھر اسی کوشش میں سرگرداں رہے۔ ادب کے محاذ سے ہٹ کر اگر کوئی ان کی نمایاں سرگرمی تھی تو وہ تھی ہندوستانی مسلمانوں کے پیچیدہ مسائل کے حل کی تلاش۔ وہ صحت منداقدار پر مبنی ایک نئے جمہوری نظام کا تصور رکھتے تھے۔

جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی قاضی سلیم کی موت پر گہرے صدمے کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کہا ہے کہ نظم میں انھوں نے اپنی طرحداری اور توانائی سے جو راہ نکالی تھی وہ ان سے مخصوص تھی۔ مظہر امام نے کہا کہ اختر الایمان کے بعد جو نئی نسل ابھری اس میں قاضی سلیم کا نام بہت نمایاں ہے۔ ان کا ایک خاص اسلوب تھا، جس کا تتبع کوئی اور نہیں کر سکا۔ پروفیسر شہریار نے قاضی سلیم کی موت کو ذاتی نقصان قرار دیتے ہوئے کہا کہ تادیر اس خلا کو پُر نہیں کیا جاسکے گا۔ مجتبیٰ حسین نے کہا کہ قاضی سلیم حسرت موہانی کے بعد واحد ایسے پارلیمانی رکن تھے جنھیں قلندر کہا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر شمیم حنفی نے کہا کہ قاضی سلیم کی موت ایک شاعر، دانشور اور نیک انسان کی موت ہے۔ شاعری میں وہ نہ صرف اپنا مخصوص رنگ رکھتے تھے بلکہ اس کے بانی بھی تھے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا ہے کہ وہ ایک اچھے انسان اچھے شاعر، اچھے دوست تھے، وہ اردو کی نمایاں آواز تھے۔ ان کی وفات سے اردو کا ایک محسن دمربی کم ہوگیا۔ (قومی آواز، دہلی)

## آمنہ ابوالحسن

● حیدرآباد، 9/اپریل۔ ممتاز افسانہ نگار اور ناول نویس محترمہ آمنہ ابوالحسن کا 9/اپریل کی صبح 9 بجے مختصر سی علالت کے بعد ان کے مکان واقع ریتی باولی میں انتقال ہوگیا۔ ان کی طبیعت صبح اچانک بگڑ گئی اور اسپتال لے جانے تک وہ انتقال کر گئیں۔ محترمہ آمنہ ابوالحسن طویل مدت تک اپنے شوہر جناب مصطفیٰ علی اکبر اردو نیوز ریڈر، آل انڈیا ریڈیو کے ساتھ دہلی میں رہنے کے بعد ان کے سبک دوش ہوجانے کے بعد اپنے آبائی وطن حیدرآباد منتقل ہوگئی تھیں۔ وہ سات کتابوں کی مصنفہ تھیں۔ جن میں پہلی کتاب "کہانی" افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ سیاہ سرخ سفید، پلس مائنس، یادش بخیر اور واپسی ان کی اہم تصنیفات ہیں۔ ان کی کتابوں پر ملک کی مختلف اردو اکادمیوں اور دیگر اداروں سے ایوارڈ مل چکے ہیں۔ وہ حیدرآباد کے نامور ایڈوکیٹ مرحوم ابوالحسن سید علی کی دختر تھیں جو قانون ساز اسمبلی کے رکن اور مجلس اتحاد المسلمین کے صدر بھی رہے تھے۔ وہ نامور دانشور پروفیسر عالم خوندمیری کی نسبتی بہن تھیں۔ ان کی تدفین قبرستان بندل گوڑہ میں ہوئی۔ اس موقعے پر اشرف صفدر علی، مزاح نگار مجتبیٰ حسین، مقبول مزاحیہ شاعر حمایت اللہ، مظہر مہدی، سعید نواب اور دیگر احباب موجود تھے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

## راہی شہابی

● نئی دہلی، 26/اپریل۔ مقبول و ممتاز شاعر راہی شہابی کا 74 سال کی عمر میں دن میں بارہ بجے جے پور میں انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال پر دہلی اردو اکادمی میں ایک تعزیتی نشست ہوئی جس میں اکادمی کے وائس چیئرمین م۔ افضل، سکریٹری مرغوب حیدر عابدی اور اکادمی کے کارکنان کے علاوہ رفعت سروش، مخمور سعیدی، شیخ سلیم احمد اور غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے بھی شرکت کی۔ م۔ افضل نے اپنی تعزیتی تقریر میں کہا کہ راہی شہابی کی شاعری ضمیر کو جھنجھوڑنے والی تھی۔ وہ نہ صرف قوم پرستی کے گن گاتے تھے بلکہ وطن پرستی اور قدیم روایات کی پاسداری بھی ان کی شاعری کی خصوصیت تھی۔ مخمور سعیدی نے کہا کہ راہی صاحب نے شروع میں بسمل سعیدی سے اصلاح لی اس رشتے سے ان کا اور میرا تعلق ایک بھائی جیسا تھا۔ ان کا اصلی نام نفاست علی تھا اور وہ پہاسو ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کنور یاسین علی خاں شہاب برنی علم و ادب کا ذوق رکھنے والے اور آغا حشر کاشمیری کے رفقا میں شامل تھے۔ شعر و ادب کا ذوق راہی صاحب کو وراثت میں ملا تھا جس کو انھوں نے کمال تک پہنچایا لیکن افسوس کہ ان کا کلام ابھی تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا ہے۔ رفعت سروش نے ان کے انداز بیان کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے کہا کہ راہی شہابی اس دور میں نظم کے تنہا شاعر تھے جنھوں نے جوش ملیح آبادی کی روایت کو پوری آن بان کے ساتھ زندہ رکھا۔ سکریٹری اردو اکادمی اور شیخ سلیم احمد نے بھی مرحوم راہی شہابی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ (قومی آواز، دہلی)

## علی احمد جلیلی

● گلبرگہ، 16 اپریل۔ انجمن ترقی اردو گلبرگہ کی مجلس عاملہ کا اجلاس بتاریخ 16/اپریل بروز ہفتہ، زیر صدارت جناب شریف احمد قریشی (صدر انجمن) منعقد ہوا جس میں قادرالکلام شاعر ڈاکٹر علی احمد جلیلی اور ممتاز ناول نگار محترمہ آمنہ ابوالحسن کے ارتحال پر خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے تقریباً دو درجن کتابیں تصنیف کی ہیں۔ شاعری میں شہر تمنا، منظر منظر، لہو کی آنچ، ورق انتخاب، اندھیرے اجالے اور ذکر حبیب ان کی یادگار ہیں۔ نثر میں نئی غزل میں منفی رجحانات، نقد و نگاہ، غالب ایک مطالعہ، فصاحت جنگ جلیل مانکپوری، اردو تلفظ لغت اور اردو کا عروض قابل ذکر ہیں۔ اجلاس میں ممتاز افسانہ نگار ناول نویس محترمہ آمنہ ابوالحسن کے انتقال پر بھی گہرے تاسف کا اظہار کیا گیا۔ (ڈاک سے)

## فرحت کمال

● گلبرگہ۔ گذشتہ دنوں افسانہ نگار جناب فرحت کمال کا انتقال ہوگیا۔ اس سانحے پر انجمن ترقی اردو گلبرگہ کی جانب سے ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی

جس میں انجمن کے عہدیداران وارکان نے اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔

فرحت کمال کو افسانہ نگاری و ناول نگاری کے علاوہ طنز ومزاح اور ڈرامے سے بھی شغف تھا اور وہ کئی ڈراموں کے کامیاب ہدایت کار بھی تھے۔ ان کے افسانوی مجموعے "پتھر کا شگاف"، "سونے کا ہرن" اور "شیشے کے پاؤں" اور ناول "ریت کا محل" شائع ہو چکے ہیں۔ (ڈاک سے)

## ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی

● اعظم گڑھ۔ شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ کے شعبۂ اردو کے سابق استاد ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے 25 اور 26 / مارچ 2005 کی درمیانی شب میں ان کے آبائی وطن موضع کھوبھنہ پوسٹ سنجر پور ضلع اعظم گڑھ میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً 72 سال تھی۔

مرحوم ایک مشفق استاد ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر اور نقاد بھی تھے۔ ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین پابندی کے ساتھ ادبی رسالوں میں شائع ہوتے تھے۔ انھوں نے گورکھ پور یونیورسٹی سے ایم اے۔ اور پھر پروفیسر محمود الٰہی کی نگرانی میں "ڈپٹی نذیر احمد حیات اور کارنامے" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ یہ مقالہ کتابی شکل میں شائع ہو کر ادبی حلقے میں بہت مقبول ہوا۔ ایک شعری مجموعہ "یہ داغ داغ کہانی" بھی 2003 میں شائع ہوا۔ ان کے انتقال پر ڈاکٹر شکیل احمد، مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی نے اظہارِ تعزیت کیا۔ (ڈاک سے)

## پروفیسر انور صدیقی

● نئی دہلی، 27 / اپریل۔ اردو اور انگریزی کے عالم اور ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر عابد حسین کی رہنمائی میں جامعہ ملیہ کی قابلِ قدر خدمات انجام دینے والے پروفیسر انور صدیقی کا 21 / اپریل کو الٰہ آباد میں انتقال ہو گیا۔ وہ 65 برس کے تھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

پروفیسر صدیقی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ انگریزی کے سربراہ اور فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز کے ڈین رہ چکے تھے اور 1997 میں سبک دوش ہوئے تھے۔ انگریزی کے علاوہ اردو ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور فانی بدایونی کی شاعری پر انھوں نے گراں قدر تحقیقی وتنقیدی کام انجام دیا تھا۔ گذشتہ دس برسوں سے وہ ذہنی طور پر معذور تھے اور اسی عالم میں ان کا انتقال ہوا۔ 27 / اپریل کو شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز کے ڈین پروفیسر اختر الواسع نے کی۔ جلسے میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، صدر شعبۂ عربی پروفیسر زبیر احمد فاروقی، ڈاکٹر خالد محمود، پروفیسر نقی حسین جعفری، پروفیسر اختر الواسع اور ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے پروفیسر انور صدیقی کی موت پر اپنے رنج وغم کا اظہار کیا۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

□□□


### ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری

**مصنف: پروفیسر گوپی چند نارنگ**

یہ کتاب اس تاریخی سچائی کو مدلل اور پرزور انداز میں سامنے لاتی ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جس میں استخلاصِ وطن کی لڑائی پورے جوش وخروش کے ساتھ لڑی گئی اور جس کے نغموں اور نعروں نے دلوں کو وہ ولولہ اور دماغوں کو وہ بصیرت عطا کی جس کی قوم کو ضرورت تھی۔

صفحات: 600، قیمت: -/300 روپے

### آندھی (منظر نامہ)

**مصنف: گلزار**

اردو زبان میں فلمی منظر نامہ ایک نئی صنفِ ادب ہے۔ اسے بصری پیکروں کا ایسا سلسلہ کہا جا سکتا ہے جو کہانی کا روپ دھارن کر لے۔ فلم "آندھی" کا یہ منظر نامہ کملیشور کے ناول "کالی آندھی" پر مبنی ہے اور اس کا اسکرین پلے، مکالمے اور گیت گلزار کے قلم سے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ عمومی دلچسپی کا باعث بھی ہوگا لیکن اس کی اشاعت کا ایک مقصد ان طلبہ اور طالبات کی رہنمائی بھی ہے جو فلمی شعبے میں اپنا مستقبل بنانے کے خواہش مند ہیں۔

صفحات: 122، قیمت: -/65 روپے

### تاریخ اور سماجیات

**مصنفہ: عائشہ بیگم**

تاریخ اور سماجیات، علم کے دو مختلف گوشے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تاریخ کا سب سے قریبی تعلق سماجیات سے ہے کیونکہ دونوں کا موضوع انسان، اس کا طرزِ عمل اور کردار ہیں۔ انسانی کردار کی داستان اس کے اخلاق وعمل اور آپسی تعلقات کی داستان ہے اور اخلاق وعمل کا انحصار بڑی حد تک ماضی کے تجربات پر بھی ہوتا ہے — اس کتاب میں اس اہم بحث کو بڑی خوبی کے ساتھ سمیٹا گیا ہے۔ طرزِ بیان استدلالی اور علمی ہے۔

صفحات: 140، قیمت: 51 روپے

### جدید سیاسی فکر

**مصنف: ڈاکٹر سید انوار الحق حقی، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی**

اس کتاب میں جدید سیاسی فکر کے پس منظر کے ساتھ ساتھ ان تمام سیاسی فلسفوں پر گفتگو کی گئی ہے جنھوں نے اس مدت میں عالمی سیاست پر اثر ڈالا اور مختلف حکومتی نظاموں کی تشکیل یا استرداد دونوں کا موجب بنے۔ قدامت پسندی، افادہ پسندی، عینیت، ثبوتیت، قانونیت، اشتراکیت اور اس کے مختلف مکاتبِ فکر، سیاسی تکثیریت، مملکت مخالف نظریات، جمہوریت مخالف نظریات، مہاتما گاندھی کا عدم تشدد کا نظریہ اور سرودیہ تحریک — یہ کتاب ان تمام عنوانات پر سیر حاصل روشنی ڈالتی ہے۔

صفحات: 305، قیمت: -/120 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

# تبصرہ وتعارف

## مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے

**مصنف: مرزا محمد زماں آزردہ**

**صفحات: 592، قیمت: 258 روپے**

**ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

**ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-66**

**مبصر: رئیس احمد**

آٹھ ابواب پر مشتمل یہ کتاب مرزا سلامت علی دبیر کی سیرت و شخصیت اور ان کے شعری اور ادبی کارناموں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ مرزا دبیر کے عہد، اُردو مرثیہ نگاری کی تاریخ اور میر انیس و مرزا دبیر کے تقابلی مطالعے پر مبنی تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی نوعیت کی ایک مکمل دستاویز ہے۔ مصنف کے تحقیقی و تنقیدی نقطۂ نظر اور ان کے استدلالی اسلوب نے ان کے بیانات کو نہ صرف استناد بخشا ہے بلکہ اردو مرثیہ نگاری کے حوالے سے یہ کتاب ایک وقیع ماخذ کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

باب اوّل مرزا سلامت علی دبیر کی ''حیات، زمانہ اور ذہنی پس منظر'' کے لیے مختص کیا گیا ہے جس میں مرزا دبیر کا سلسلۂ نسب، بزرگوں کے احوال و کوائف، دبیر کے والد مرزا غلام حسین کی ولادت اور شادی مرزا دبیر کی ولادت اور گھریلو ماحول پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مرزا محمد زماں آزردہ نے اس مطالعے میں مرزا دبیر کے معاصر مصنفین اور تذکرہ نگاروں کے بیانات کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اس باب کے مطالعے سے مرزا دبیر کا مذہب و مسلک، ورود لکھنؤ، حلیہ، علمی استعداد اور سلسلۂ تلمذ، اخلاق و عادات اور ہمعصر اساتذۂ فن مثلاً مرزا غالب، شیخ ناسخ، خواجہ آتش اور میر ضمیر سے ان کے باہمی روابط کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے۔

''قطعاتِ تاریخ وفات'' اور ''عکس'' استشہاد و نقول فرامین شاہی بسلسلۂ حالاتِ بزرگاں'' پر یہ باب ختم ہوتا ہے۔ افضل حسین ثابت لکھنوی صاحب ''حیاتِ دبیر'' کے کہے ہوئے قطعۂ تاریخ وفات کے آخری مصرعے کے دوٹکڑوں سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

آسماں بے ماہ تاباں سدرہ بے روح الامیں

طور بے موسیٰ، ادب بے شمع، منبر بے دبیر (ص 161)

1292ھ　　1292ھ

باب دوم مرزا سلامت علی دبیر کے شعری کارناموں کے بیان پر مشتمل ہے جس میں شعر گوئی کی ابتدا اور غزل گوئی کے علاوہ دیگر اصناف سخن مثلاً رباعی، سلام، قصیدہ، مثنوی اور تاریخ گوئی کو بطور خاص موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس باب میں مرزا محمد زماں آزردہ نے نہ صرف متعلقہ اصناف سخن کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ذخیرے کی نشان دہی معتبر حوالوں کے ساتھ کی ہے ان کی نقول اور عکس بھی پیش کیے ہیں، جو تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ مرزا دبیر پر مزید تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے یہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام بہت کارآمد ثابت ہوگا۔ بطور نمونہ مرزا دبیر کی ایک غزل کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

دفن کرنا مجھ کو کوئے یار میں

قبر بلبل کی بنے گلزار میں

قبر میں روزن مری رکھنا ضرور

مر گیا ہوں انتظار یار میں

بعدِ مردن میرے لاشے کو دبیر

جا کے رکھنا کوچۂ دلدار میں

(اشعار کی تعداد 8، ص 171-170)

باب سوم میں فن مرثیہ نگاری کے بہ تدریج ارتقائی سفر کے تناظر میں مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ان کے شاعرانہ اوصاف و محاسن کو مع دلائل و امثال واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، جن میں 'موضوع' اور 'زبان و بیان' کے علاوہ 'جذبات نگاری، واقعہ نگاری، منظر نگاری، کردار و مکالمہ نگاری اور رزمیہ عناصر کے ساتھ ساتھ' واقعاتِ الیہ اور بین' اہم ہیں۔ مضمون آفرینی کے تعلق سے مرزا دبیر کے مرثیے کا یہ بند ملاحظہ کیجیے جسے سن کر بقول مصنف شیخ ناسخ نے کہا تھا کہ۔ ('سلامت علی (مرزا دبیر) سا طبیعت دار خلاق مضامین نہ ہوا ہے نہ ہوگا'۔

کیوں مدِ نظر چشم کو گردش ہے ہر اک بار

پہلو کو بدلتے ہیں مگر مردمِ بیمار

ابرو کے قرینے سے کھلا چشم کا اسرار

ہیں نور کے گہوارے میں عیسیٰ خوش اطوار

ہاں پنجۂ مریم کہوں پنجے کو پلک کے

گہوارے میں عیسیٰ کو سلاتی ہیں تھپک کے

باب چہارم کو سابقہ باب کا ہی ایک ذیلی حصہ قرار دیا جا سکتا ہے چونکہ اس میں مرزا دبیر کی بعض دیگر شعری خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے، ان میں صنائع لفظی

وصنائع معنوی کے بہتر استعمال اور جدت وندرت بیانی کے علاوہ زود گوئی پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کی یہ رائے بڑی جامع ہے کہ "مرزا صاحب کے مراثی کی بدولت اردو تقریباً ان تمام صنائع و بدائع سے مالا مال ہوگئی جو عربی اور فارسی شاعری کا طرۂ امتیاز تھیں"۔

(ص 322 (بحوالہ دبستان دبیر ص 152)

باب پنجم میں مرزا دبیر کے جملہ دستیاب مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مراثی کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں اور جن نادر و نایاب مخطوطات تک مصنف کی رسائی ممکن ہوسکی ہے ان کے عکس بھی کتاب میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ آخر میں دفتر ماتم، جلد اوّل تا چہاردہم کا اشاریہ بڑا اہم ہے، جو تحقیق و تنقید سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لیے ایک بیش قیمت تحفے سے کم نہیں۔

مرزا دبیر شاعری کے علاوہ نثر کے میدان میں بھی دخل رکھتے تھے، یہ الگ بات ہے کہ یہاں انھیں وہ شہرتِ دوام حاصل نہ ہوسکی جو انھیں شاعری میں حاصل ہوئی، یا پھر یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان کے شاعرانہ کمالات ان کی نثری فتوحات پر غالب رہے۔ باب ششم میں ان کی فارسی اور اردو نثر نگاری سے متعارف کرایا گیا ہے اور ان کی نثری تصنیف ''ابواب المصائب'' پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار مطبع یوسفی دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ دیباچے اور ترجمے کے مطابق اس کا سال تصنیف 1245ھ (1829ء) قرار پاتا ہے۔ مرزا دبیر نے ''ابواب المصائب'' ''روضۃ الشہدا'' سے متاثر ہو کر لکھی تھی جسے دبستان لکھنؤ کی نثری نگارشات کے اوّلین نقوش میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے جس میں تاریخی واقعات کو احادیث و روایات کے تناظر میں بڑے دلچسپ اور دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ''رسالۂ دبیر'' اور ''معجزۂ جناب امیر المومنین'' جیسے مختصر نثری مخطوطات کا تعارف کرانے کے علاوہ ان کے عکس بھی شاملِ کتاب کیے گئے ہیں، جو مصنف کے مندرجات کو پایۂ استناد عطا کرتے ہیں۔

باب ہفتم کو مرزا دبیر اور میر انیس کے تقابلی مطالعے کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ ایک طویل بحث طلب موضوع ہے لیکن مصنف نے اپنے منطقی طرز بیان سے اردو مرثیے کی ان دونوں قد آور شخصیات کے موازنے میں غیر جانب داری اور انصاف سے کام لیا ہے اور صاحب ''موازنۂ انیس و دبیر'' کے بعض جانب دارانہ فرمودات کی مدلل انداز میں تردید کی ہے۔ تفصیل سے قطع نظر اپنی بات کی تائید میں مصنف کا نقل کردہ یہ واقعہ ملاحظہ کیجیے:

''ایک مرتبہ مفتی میر محمد عباس کی خدمت میں ایک سوال بھیجا گیا کہ لوگوں میں اختلاف ہے کہ میر صاحب (میر انیس) کا مرتبہ شعر گوئی و نظم مرثیہ میں زیادہ بلند ہے یا مرزا صاحب (مرزا دبیر) کا۔ لہٰذا اس کا فیصلہ آپ کریں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میر صاحب کا کلام فصیح اور شیریں ہے اور مرزا صاحب کا کلام دقیق اور بلیغ۔ دونوں کا ذائقہ الگ الگ ہونے کی وجہ سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی کیونکہ بعض طبیعتیں نمک کو پسند کرتی ہیں اور بعض شیرینی کو''

(ص 467 (بحوالہ تجلیات ص 191)

آخری باب میں مرزا دبیر کی شاعرانہ عظمت اور ان کے ادبی مرتبے سے بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے اپنے مختصر مگر جامع تجزیاتی مطالعے میں کہا ہے کہ ''اردو مرثیہ نگاری کی تاریخ میں ان کے طرزِ سخن کا ثانی ہنوز پیدا نہ ہوسکا ہے۔ مرزا دبیر نے اردو مرثیے کو تمام اصناف سخن کا سرچشمہ بنا دیا' وہ پہلے مرثیہ گو تھے جو علوم مشرقیہ پر عالمانہ دسترس رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی ایجاد پسند طبیعت سے اردو مرثیے کو مضامینِ عالی عطا کیے۔ مختصراً یہ کہ مرزا دبیر کی طبیعت میں مختلف قسم کے کمالات کا جوہر موجود تھا جسے انھوں نے صحیح معنوں میں استعمال کیا۔''

(ص 536)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی یہ پیش کش کتاب زیر تبصرہ کی تیسری لیکن قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام اس کی پہلی اشاعت ہے۔ قومی اردو کونسل کا یہ 'حسن انتخاب' یقیناً قابل داد ہے جس کے لیے وہ بجا طور پر مبارکباد کی مستحق ہے۔

●

## میرا/گلزار

**صفحات: 228، قیمت: 120 روپے**

**ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

**ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-66**

**مبصر: جاوید رحمانی**

گلزار کی اردو زبان اور ہندوستانی تہذیب سے والہانہ وابستگی ہے اور انھوں نے فلمی دنیا میں بھی ان تہذیبی اقدار کے فروغ کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ انھوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر فلمیں بنائیں اور اپنے تخلیقی ذہن کا بھرپور استعمال ان فلموں میں کیا۔ انھوں نے جب چھوٹے پردے کا رخ کیا تو مرزا غالب جیسا شاہکار سیریل پیش کیا جس نے ان کی شہرت کو نصف النہار پر پہنچا دیا۔ فلم اور ٹی.وی. سیریل سے ہٹ کر گلزار کا ایک اور میدان عمل ہے جس پر وہ یکساں توجہ دیتے ہیں، یہ میدان ہے ادب و شاعری کا۔ فلم ساز اور ہدایت کار گلزار سے کم مرتبہ شاعر اور افسانہ نگار گلزار کا نہیں ہے۔ گلزار نے حال میں ایک اہم منصوبے کے تحت اپنی فلموں آندھی، خوشبو، ہوتو تو، لباس، میرے اپنے اور کوشش کے منظر نامے کتابی شکل میں تیار کیے ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ''میرا'' بھی ہے۔ فلمی منظر ناموں کو شائع کرنے کا ایک مقصد جہاں اردو زبان و ادب کی اس روایت کو جو مغلِ اعظم، انارکلی، پاکیزہ، رضیہ سلطانہ اور بازار وغیرہ کی شکل میں

موجود ہیں، محفوظ کرتا ہے وہیں دوسری جانب ان طلبہ وطالبات کو اس تکنیک سے روشناس کرنا بھی مقصود ہے جو اسکرپٹ لکھنے اور مکالمہ نگاری کے میدان میں اپنا مستقبل بنانے کے خواہاں ہیں۔

یہ منظر نامہ 143 صفحات پر محیط ہے۔ اس سے پہلے شروعات کی سرخی کے تحت گلزار نے 1975 سے 1978 تک کی روداد لکھی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ انھیں ''میرا'' پر فلم بنانے کا خیال کس طرح آیا اور کیسے یہ فلم مکمل ہوئی۔ اس کے بعد ''احوال'' کے تحت ''میرا'' میں واقعات کے انتخاب پر روشنی ڈالی گئی ہے یہ حصہ نہایت دلچسپ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے بقول ''تاریخ کی گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک اور بات کا تجربہ بڑی گہرائی سے ہوا۔ کچھ انسان اتنے بڑے ہوئے ہیں اور وقت نے انھیں اتنی زیادہ عزت دی ہے کہ انھیں انسان نہیں رہنے دیا۔ کہیں مورتی بنا دیا، کہیں گرنتھ، کہیں صرف ایک لفظ یا بس ایک نام جیسے کرشن ــــ ان کی عظمت سے انکار نہیں لیکن انسانوں کی طرح آپ ان کے پیر بھی نہیں چھو سکتے، منع ہے۔ تاریخ کی ایسی ہستیوں کو دیکھنا اور چھونا مشکل ہوجاتا ہے، میرا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اپنے زمانے کی بہت بڑی شاعرہ اور ایک مکمل عظیم انسان تھیں لیکن لوگ اپنے عقیدے کی وجہ سے انھیں انسان کی طرح دیکھنے کو تیار نہیں ہوتے۔ حالانکہ ایسے ہونے سے ان کی ہستی کسی طرح چھوٹی نہیں ہوتی، بلکہ وہ جو ناممکن ہے، ممکن معلوم ہونے لگتا ہے۔ ایسی ہی ایک کوشش میں نے میرا میں کی ہے۔'' اس کتاب کے مطالعے سے انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں پر گلزار کی گہری نظر کا ثبوت ملتا ہے۔ اس منظر نامے میں راجا بھوج راج، مہنت اور وکرم جیت کی کشمکش کو جس طرح ابھارا گیا ہے اس سے گلزار کی انسانی رشتوں اور نفسیات کی پیچیدگیوں پر گرفت کا پتہ چلتا ہے اور اس سے میرا کے ساتھ ساتھ دیگر کرداروں سے بھی ہمدردی پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ گلزار کی کامیابی کی دلیل ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی اس پیش کش کو آر۔ایل۔مشرا نے ترتیب دیا ہے، جس کا ترجمہ کلیم اللہ نے کیا ہے۔

•

**ہندوستان کا صنعتی ارتقا/ڈاکٹر ڈی۔آر۔گیڈگل**

**مترجم: پروفیسر ایم۔صدیقی**

**صفحات: 343، قیمت:-/130روپے**

**ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

**ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-66**

**مبصر: ایس۔اے۔رحمٰن**

اس کتاب کا پہلا انگریزی ایڈیشن 1924 میں شائع ہوا تھا اور اس میں انیسویں صدی کی پانچویں دہائی سے پہلی جنگِ عظیم کے آغاز یعنی 1914 تک ہندوستان کی صنعتی تاریخ کا جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ پیش لفظ کے مطابق یہ تحقیقی مقالہ پہلے کیمبرج یونیورسٹی کے ماسٹر آف لیٹرس کی ڈگری کے لیے تیار کیا گیا تھا اور چند لفظی تبدیلیوں کے سوا یہ تقریباً اسی شکل میں طبع ہوا جس شکل میں مرتب ہوا تھا۔ 1929 میں اس کے دوسرے ایڈیشن کے وقت اصل کتاب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا گیا جو 1914 کے بعد کے دور کی اقتصادی تاریخ کے تمام پہلوؤں پر مشتمل تھا۔ 1933 میں جب تیسرا ایڈیشن شائع ہونے لگا تو زمانے کا لحاظ رکھتے ہوئے اس باب پر نظرثانی کی گئی۔ 1942 میں جب چوتھا ایڈیشن چھپنے لگا تو 1914 کے مابعد دور سے متعلق باب میں کوئی ترمیم واضافہ نہیں کیا گیا بلکہ ایک طویل پیش لفظ شامل کیا گیا جس میں تیسری دہائی کی مدت میں پیدا ہونے والی صورت حال کو زیر بحث لایا گیا۔

مصنف کے بقول ''جب پبلشرز نے ایک نئے ایڈیشن کے لیے مزید نظرثانی کا سوال اٹھایا تو مجھے دو اہم فیصلے کرنے پڑے۔ پہلا یہ کہ کس دور کا احاطہ کیا جائے اور دوسرا یہ کہ سابق مواد کو کس طرح پیش کیا جائے۔ 1857 سے 1947 تک کا زمانہ وہ تھا جب کہ غیر منقسم ہندوستان انگریزی سلطنت کے براہ راست انتظام کے تحت تھا۔ ارادہ تو یہ تھا کہ اقتصادی تاریخ کے اس مطالعے کو 1947 تک سمیٹ لوں لیکن وقت کی کمی کے باعث اس ایڈیشن کے مواد کو 1939 تک ہی محدود کرنا پڑا۔'' اس طرح دیکھا جائے تو مصنف کے مطابق 1860 سے 1914 تک کا جائزہ کیمبرج کے مقالے کے مطابق اصل شکل میں قائم رکھا گیا ہے اور 1914 سے 1939 کا جائزہ ازسرنو لیا گیا ہے۔ گویا یہ کتاب ہندوستان کے اس عہد کے صنعتی ارتقا کی تاریخ ہے جب یہاں انگریزوں کی حکومت تھی۔ زیر نظر اشاعت اسی مذکورہ ایڈیشن کا اردو ترجمہ ہے جس میں 1860 سے 1939 تک کے ہندوستان میں ارتقا پذیر صنعت وزراعت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب بیس ابواب پر مشتمل ہے جن میں صنعت کے موضوع پر گفتگو کی گئی ہے۔ ان میں دستی صنعتوں کے انحطاط اور جدید صنعت کے آغاز کا جائزہ شامل ہے۔ کارخانے، کاشتکار، ریلوے، آب پاشی، شہروں کی ترقی، شہری صنعت کی تنظیم اور دیہات کے کاریگر اس کتاب کے خاص موضوع ہیں۔ علاوہ ازیں جنگ سے پہلے کے عہد کا ماحصل بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ صنعت وحرفت اور زراعت سے متعلق حکومت کے قوانین اور ٹیکسوں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب آزادی سے پہلے کے ہندوستان کے صنعتی و زراعتی منصوبوں کا معتبر منظر نامہ ہے اور یقیناً اسی منظر نامے کی اساس پر آزادی کے بعد صنعت وحرفت اور زراعت کی ترقی کے لیے اقدامات کیے گئے جس سے

زرعی میدان میں ہمارا ملک خودکفیل ہوا اور صنعت وحرفت کے مختلف میدانوں میں اپنی شناخت مستحکم کی۔ کتاب کا اردو ترجمہ سادہ اور سلیس ہے۔ اس کی اشاعت پر قومی اردو کونسل مبارکباد کی مستحق ہے۔

•

## مغیث الدین فریدی اور قطعات تاریخ / شیخ عقیل احمد

**صفحات:269، قیمت:-/200روپے**

**ناشر: مصنف 262۔ ڈی، شہر اسن سٹی، اندرا پورم، غازی آباد، یوپی**

**مبصر: احمد کفیل**

اردو شعر و ادب میں تاریخ گوئی کی روایت بہت پرانی ہے۔ اس فن میں حسرت عظیم آبادی سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاریخی قطعات لکھنا اپنے آپ میں ایک معنی خیز عمل ہے جہاں شاعری اپنے معنی ومفہوم میں علم ریاضی کے ساتھ مِتّصل ہو کر نمو پذیر ہوتی ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ آج تک اسے شعری اصناف میں جگہ نہیں مل سکی ہے۔ قدیم زمانے میں بھی قطعات تاریخ لکھے جاتے تھے اور آج بھی لکھے جا رہے ہیں۔ یہ کہنا کہ دور جدید میں تاریخ گوئی کی روایت دیگر شعری آداب ورسومات کے ساتھ ختم ہو چکی، قطعی درست نہیں۔ اپنی افادیت اور فنی خوبیوں کے باوجود ہر دور میں اس فن کی رفتار سست رہی ہے۔ موجودہ دور میں رئیس انور، عبدالمنان طرزی، قمر سنبھلی، رزاق افسر اور ڈاکٹر واحد نظیر وغیرہ کی تاریخ گوئی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ مغیث الدین فریدی کو اس فن میں مہارت تھی۔ ایک اندازے کے مطابق انھوں نے لگ بھگ ایک ہزار قطعات تاریخ کہے جن میں کچھ تو ضائع ہو گئے اور جو قدردانوں کے پاس محفوظ رہ گئے وہ ''مغیث الدین فریدی اور قطعات تاریخ'' کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

مصنف نے جس انداز میں مغیث الدین فریدی کی زندگی، ان کی شخصیت، ان کی دانشورانہ حیثیت اور تاریخ گوئی کی روایت کو سمجھا اور اپنی کتاب میں سمیٹا ہے وہ واقعی قابلِ تحسین ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مغیث الدین فریدی کو تاریخ گوئی سے ایک والہانہ لگاؤ تھا۔ اگرچہ انھوں نے اپنی شاعری میں غزلوں کی طرف خاص توجہ دی اور تاریخی قطعات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا تاہم یہی تاریخی قطعات آج ان کی شعری اور تخلیقی انفرادیت کی شناخت ہیں اور اس ضمن میں شیخ عقیل احمد کی یہ کاوش جو پانچ ابواب پر مشتمل ہے، قابلِ تحسین ہے۔

پہلے باب ''آئینہ'' میں مغیث الدین فریدی کے سوانحی کوائف، دوسرے باب ''روبرو'' میں مغیث الدین فریدی کا انٹرویو، تیسرے باب ''یادیں'' میں مغیث الدین فریدی کی شخصیت، چوتھے باب ''رخش فریدی'' میں فن تاریخ گوئی، اس کی روایت اور فریدی کا مقام اور آخری باب میں فریدی کے 186 تاریخی قطعات شامل ہیں۔ یہ تاریخی قطعات کئی نوعیت کے ہیں۔ بزرگان دین سے متعلق قطعات میں خواجہ غریب نواز، بابا فرید گنج شکر، حضرت نظام الدین اولیا، حضرت امیر خسرو اور خواجہ حسن نظامی وغیرہ شامل ہیں۔ اہم ادبی شخصیات کو اعزازات دیے جانے کے موقعے پر کہے گئے قطعات میں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر محمد حسن، عابد پیشاوری، آنند نرائن ملا، پروفیسر امیر حسن عابدی، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر عبدالودود اظہر، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کے نام قابل ذکر ہیں۔ قطعات تاریخ وفات میں فیض احمد فیض، سجاد ظہیر، رشید احمد صدیقی، مجنوں گورکھپوری، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، فراق گورکھپوری، امتیاز علی خاں عرشی، شکیل بدایونی، عظیم الحق جنیدی، خواجہ احمد فاروقی، میکش اکبرآبادی، صبا اکبرآبادی، جواہر لال نہرو، فخرالدین علی احمد، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور عبدالماجد دریابادی شامل ہیں۔

قطعات تاریخ میں واقعات زمانہ کا بیان یا مورخین کی اصطلاح میں کسی مشہور واقعے کی مدت معین کرنے کو تاریخ گوئی کہتے ہیں۔ بڑے کارنامے انجام دینا اور انھیں تاریخ میں محفوظ رکھنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ نہ صرف کتابوں میں بلکہ عمارتوں اور مقبروں پر کندہ تحریریں اس بات کا بیّن ثبوت ہیں۔ اس فن میں اہم واقعات وحادثات یاد رکھنے کے لیے عدد کا رشتہ موزوں الفاظ سے جوڑ دیا جاتا ہے تاکہ قوت حافظہ آسانی سے اسے اپنے نہاں خانوں میں محفوظ رکھ سکے۔ یہ فن دنیا کی بیشتر زبانوں میں رائج ہے۔ اردو میں عربی ''ابجد'' طریقے سے اٹھائیس حروف ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، ثخذ، ضظغ کی قیمت ایک طے شدہ ترتیب کے ساتھ مقرر ہے۔ ان حروف کے اعداد وشمار طے ہونے کے باوجود قطعات تاریخ سے کماحقہٗ واقفیت کے لیے اس کے مسلمہ اصول اور اقسام کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ شیخ عقیل احمد نے اس کتاب میں ان تمام پہلوؤں پر بڑی باریکی سے بحث کی ہے۔

•

## آہنگ آگہی / پیارے لال رتن

**صفحات:136، قیمت:-/150روپے**

**ناشر: ادبی کارنر، 92، گروامرداس مارکیٹ، کھرڑ، پنجاب**

**مبصر: نبیل عارفی**

''آہنگ آگہی'' پیارے لال رتن کا تازہ شعری مجموعہ ہے جس میں نظمیں، غزلیں، قطعات اور رباعیات شامل ہیں۔

اس مجموعے میں انھوں نے نظموں کو اوّلیت دی ہے۔ مشمولہ نظموں میں جہاں 'آداب نو'، 'زندگی' اور 'ہم ہیں ہندوستانی' جیسی اصلاحی نظمیں ہیں وہیں 'اندھیرا'، 'جلا وطنی' اور 'مشورہ' ایسی نظمیں ہیں جو اپنے مواد، ہیئت اور لب ولہجے کی

وجہ سے منفرد مقام کی حامل ہیں۔

پیارے لال رتن کی غزل قدیم و جدید کے درمیان ایک مضبوط کڑی ہے جس نے ایک دوسرے کو جوڑے رکھا ہے۔ بطور مثال چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

میں تو گھر میں بھی بہت دور رہا ہوں گھر سے
مجھ کو بن باس کی عادت ہے ڈراتے کیوں ہو

ختم ہوگی نہ داستاں اس کی
آدمی کام کا تھا، کام آیا

پیارے لال رتن کی غزلوں میں جو آگہی کا شعور دیکھنے کو ملتا ہے وہ بھی کچھ کم مرتبے کی بات نہیں۔ چھوٹی بحروں میں شعر کہنا آسان نہیں مگر رتن صاحب چھوٹی بحروں میں بھی اسی کامیابی کے ساتھ شعر کہتے چلے جاتے ہیں جیسے کہ طویل بحروں میں

ہنستے ہیں چہرے کے داغ
میں کرتا ہوں درپن صاف

اب دریچے ادھر نہیں کھلتے
اب دریچوں سے کٹ گیا آنگن

رتن صاحب ہندی لفظیات کو بھی اپنی غزلوں میں بڑے ہی فنکارانہ انداز میں استعمال کرتے ہیں جو ان کے حسنِ انتخاب کی دلیل ہے۔ استعارے اور علامت سے بھی وہ اکثر کام لیتے ہیں آخر میں دو شعر ملاحظہ کیجیے۔

کم نگاہی ترے تقاضوں سے
روشنی کا بھرم نہ کم ہوگا

بیتے لمحوں کی کہانی لکھ رکھو
حافظے کی شاخ مرجھانے لگی

بہ اعتبار مجموعی ''آہنگ آگہی'' کی غزلوں میں ایک ایسی اپنائیت اور رجائیت دیکھنے کو ملتی ہے جو غزل کے شیدائی کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

□□□


**جنوبی ہند کی تاریخ**

**مصنف: کے اے نیل کنٹھ شاستری**

**مترجم: آر کے کملاکر**

جنوبی ہند کی تاریخ پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کتاب میں جنوبی ہند کی قدیم تاریخ سے سترھویں صدی کے نصفِ اول تک کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 576، قیمت: 114 روپے

**دکنی نثر کا انتخاب**

**مرتبہ: سیدہ جعفر**

دکنی نثر کا یہ انتخاب دکن میں اردو نثر کی ابتدا سے فورٹ سینٹ جارج کالج کے زمانے تک کے مصنفین کا احاطہ کرتا ہے اور ان کی تصانیف کے نمائندہ منتخبات پر مشتمل ہے۔

صفحات: 168، قیمت 45 روپے

**سخنورانِ گجرات**

**مرتب: سید ظہیر الدین مدنی**

گجرات میں اردو شعر و ادب کی نشاندہی پندرھویں صدی کے نصف آخر سے کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں ابتدا سے 1950 تک کے شعرا کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تبصرہ، سیاسی اور سماجی پس منظر کے ساتھ درج ہے۔

دوسرا ایڈیشن، صفحات: 340، قیمت: 77 روپے

**کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ**

**مرتبہ: ڈاکٹر سیدہ جعفر**

گولکنڈہ کا پانچواں تاجدار محمد قلی قطب شاہ بہ یک وقت کئی اوصاف سے متصف تھا۔ اس کا ایک اہم وصف شعر گوئی بھی تھا۔ یہ اس کا مستند کلیات ہے جس میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی شامل ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 824، قیمت: 157 روپے

**قطب مشتری**

**مصنف: اسد اللہ وجہی**

''قطب مشتری'' اردو کی ابتدائی طبع زاد مثنویوں میں کئی لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ مثنوی کے متن کے ساتھ سو صفحوں پر مشتمل عالمانہ مقدمے نے کتاب کی قدر و قیمت مزید بڑھا دی ہے۔

(چوتھا ایڈیشن)

صفحات: 234، قیمت: 48 روپے

**کلیاتِ سراج**

**سراج اورنگ آبادی**

**مرتب: عبدالقادر سروری**

سراج اورنگ آبادی اردو کے کلاسیکل شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ دیباچے میں ان کی شاعرانہ خصوصیات اور ان کے شخصی اوصاف کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 732، قیمت: 138 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: انیل اکبوٹے بچوں کا گوشہ

ترجمہ: محمد عمر برنی

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انہیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

ذیل میں قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب ''ہمارے رہنما'' جلد ششم سے اقتباس پیش کیا جارہا ہے۔ اس کتاب میں ان تمام قومی رہنماؤں کی حیات و خدمات سے واقف کرایا گیا ہے جنھوں نے ملک و قوم کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ ''ہمارے رہنما'' کی اس جلد میں دادا بھائی نوروجی، چترنجن داس، راش بہاری بوس، ایس. ستیہ مورتی، بی. آر. امبیڈکر اور کملا دیوی چٹوپادھیائے سے متعارف کرایا گیا ہے۔ 128صفحات پر مبنی اس جلد کی قیمت -/35روپیے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو چالیس فیصد رعایت دیتی ہے۔

# بی. آر. امبیڈکر

ہندوستان میں ہندوؤں میں کچھ لوگ نیچ ذاتوں کے مانے جاتے تھے۔ برسوں سے سماج میں نہ کوئی ان کی فکر کرتا تھا اور نہ کوئی ان سے پیار کرتا تھا۔ اونچی ذات کے ہندو ان سے نفرت کرتے تھے۔ ان کی بے عزتی کرتے تھے اور ان سے میل جول بھی نہیں رکھتے تھے اور ان اچھوتوں کو اپنے درمیان رہنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ وہ ان کے کنوؤں کے پانی کو نہ چھو سکتے تھے، نہ گاؤں کے تالابوں سے پانی بھر سکتے تھے۔ اچھوت ہندوؤں کے مندر میں نہیں جاسکتے تھے اور ان کو تعلیم سے محروم کردیا گیا تھا۔ اچھے کام یا تجارت تک ان کی پہنچ نہیں تھی۔ ان کا کام سڑکوں، گلیوں میں جھاڑو لگانا، جوتے بنانا یا ان کی مرمت کرنا، بید کے ٹوکرے بننا، یا مردہ جانوروں کی کھال اتارنا تھا۔ ان میں سے کچھ خوش قسمت بندھوا مزدور کے روپ میں زمینداروں کے کھیتوں یا گھروں میں یا گاؤں کے دفتروں میں ملازم تھے۔ اس سے بھی زیادہ بے عزتی اور دکھ کی بات یہ تھی کہ ان کے لباس اور غذا کے بارے میں سخت قوانین تھے۔ اسی طرح یہ بھی طے تھا کہ وہ کون سی دھات کے برتن یا زیورات استعمال کریں گے۔

ایسے ہی ایک اچھوت، مراٹھی زبان بولنے والے ماہر خاندان میں ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کا جنم ہوا جن کو 1990 میں ان کی موت کے عرصے بعد قوم نے فخر اور شکریہ کے جذبے کے ساتھ ملک کے سب سے بڑے اعزاز بھارت رتن کا خطاب دیا۔

## بچپن

بابے بھیم 14/اپریل 1891 کو پیدا ہوئے۔ ان کے باپ کا نام رام جی اور ماں کا نام بھیما بائی سکپال تھا اور وہ اپنے

والدین کی چودھویں اولاد تھے۔ سب پیار سے انھیں بھیما کہتے تھے اور بھیم راؤ کے نام سے انھوں نے کالج کی تعلیم مکمل کی۔ اپنے دادا مالوجی کی طرح سے ان کے والد رام جی سکپال برطانوی سرکار کی فوج میں ملازم تھے۔

ان دنوں حکومت برطانیہ نے فوج میں کام کرنے والوں کے لیے تعلیم لازمی کر رکھی تھی۔ سرکار ان جوانوں کی عورتوں اور بچوں کی تعلیم کے لیے اسکول چلاتی تھی۔ مالوجی اور رام جی دونوں ایسے خوش قسمت تھے جن کو تعلیم کا فائدہ پہنچا۔

بھیم راؤ بھی دو سال ہی کے تھے کہ ان کے باپ فوج کی ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ 14 برس تک رام جی فوج کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہے تھے اور ریٹائرمنٹ کے وقت ان کا عہدہ دوسری گرینڈیرز میں صوبیدار میجر کا تھا۔ یہ خاندان وسطی چھوڑ کر کونکن علاقہ میں داپولی مقام پر جابسا۔ کونکن مغربی گھاٹ پر ساحلی علاقہ ہے۔ پانچ سال کی عمر میں بھیم جی اسکول میں داخل ہوئے۔ جلد ہی رام جی کو ستارا میں ملازمت مل گئی۔ اس طرح یہ خاندان بھی ستارا چلا گیا۔ یہاں پر بھیم راؤ اور ان کے بڑے بھائی آنند نے چھاؤنی میں گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔

ابھی بھیم راؤ چھ سال ہی کے تھے کہ ان کی ماں بھیما بائی کا انتقال ہوگیا۔ رام جی کی بہن میرا بائی نے اس خاندان کی دیکھ بھال شروع کردی۔ میرا بائی ناٹی، کبڑی اور خوش مزاج خاتون تھیں۔ رام جی اور بھیما بائی کی چودہ اولادوں میں صرف پانچ بچے، تین بیٹے اور دو بیٹیاں زندہ رہیں۔ لڑکیوں کی شادی ہوگئی تھی اور وہ اپنے شوہروں کے ساتھ رہتی تھیں۔ بھیم راؤ جو پانچوں میں سب سے چھوٹے تھے سب کے لاڈلے تھے۔

رام جی سکپال کافی سخت ڈسپلن والے آدمی تھے۔ وہ خود نہایت سادگی پسند اور نیک آدمی تھے۔ انھوں نے گوشت اور شراب کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے بچے تعلیم حاصل کریں اور اچھے کردار کے مالک ہوں۔ بہت سویرے وہ اپنے بچوں کو بھجن سناتے۔ رامائن اور مہابھارت سے کہانیاں بھی پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے بچوں کو سنت تکارام، نام دیو، مورو پنت اور مکتیشور کے بھجن اور گیت زبانی یاد کرا دیے تھے۔ ہر روز شام کو باپ اور بیٹے مل کر یہ بھجن یا گیت گاتے تھے۔ اس مشق کا بھیم راؤ کے دماغ پر بہت اچھا اثر پڑا۔ اس کے علاوہ ان سے انھیں نہایت نفیس مراٹھی زبان سیکھنے اور لکھنے کا موقع ملا۔

رام جی سکپال جوتیبا پھولے کے دوست تھے اور ان کی بہت تعریف کرتے تھے۔ جوتیبا پھولے اچھوتوں کو تعلیم دینے اور سماجی طور پر اونچی ذات والوں کے برابر درجہ دلانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ رام جی جوتیبا پھولے کے مشن سے بہت متاثر تھے اور ہر طرح اچھوتوں کی مدد کرتے تھے۔ اپنے ان کاموں سے انھوں نے اپنے بچوں کے سامنے اپنی پاک صاف مثال بنائی تھی۔

## اچھوت

رام جی نے ایک بیوہ جیجا بائی سے شادی کرلی اور اسے گھر لے آئے۔ ننھا بچہ بھیم اپنی سوتیلی ماں سے پیار نہ کرسکا۔ وہ

خاص طور پر انھیں اس وقت ناپسند کرتا تھا جب وہ اس کی ماں کی ساڑیاں یا گہنے پہنتی تھیں۔

بھیم کو بھی اب اس کڑوی سچائی کا پتہ چلنے لگا کہ وہ پیدائشی طور پر ایک اچھوت ہیں۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ دوکاندار سامان کے پیکٹ ان کی ماں کے ہاتھوں میں پھینک دیا کرتے تھے تاکہ کہیں وہ اس کی ماں کو نہ چھولیں۔

اسکول میں بھیم فرش پر ایک کونے میں بٹھائے جاتے تھے۔ انھیں بیٹھنے کے لیے اپنے ساتھ بوری کا ایک ٹکڑا لے جانا ہوتا تھا۔ استاد ان کی کاپی کتابیں نہیں چھوتے تھے۔ کچھ تو ان سے سوال بھی نہیں پوچھتے تھے یا کتاب پڑھنے کو نہیں کہتے تھے۔ اگر انھیں اسکول میں پیاس لگتی تو وہ اسی صورت میں پیاس بجھا سکتے تھے کہ کوئی ان کے کھلے منہ میں پانی ڈالنے کو تیار ہو جاتا۔

ایک بار گرمیوں میں بھیم اور ان کے بڑے بھائی آنند اور ان کا چھوٹا بچہ ٹرین سے اپنے باپ سے ملنے گورے گاؤں روانہ ہوئے جہاں وہ خزانچی تھے۔ ان کی روانگی کی اطلاع رام جی تک نہیں پہنچی۔ ریلوے اسٹیشن پر ان کے لیے کوئی نہیں تھا۔ کافی دیر انتظار کے بعد انھوں نے ایک بیل گاڑی گورے گاؤں جانے کے لیے کرائے پر لی۔ ابھی گاڑی نے مشکل ہی سے حرکت کی تھی کہ گاڑی بان نے محسوس کیا کہ صاف ستھرے کپڑوں میں بچے اچھوت ہیں۔ غصے میں آکر اس نے انھیں بیچ سڑک پر اتار دیا۔ کافی خوشامد اور لالچ دینے پر گاڑی بان دوگنے کرائے پر انھیں لے جانے کے لیے تیار ہوا۔ وہ بھی اس معاہدے پر کہ آنند گاڑی ہانکے گا اور گاڑی بان پیدل گاڑی کے پیچھے چلے گا۔ اس طرح بچوں نے رات کی تاریکی میں سفر طے کیا۔ راستے میں انھیں پینے کے لیے پانی نہیں ملا۔ جب وہ پانی مانگتے تھے تو لوگ یا تو صاف طور پر انکار کر دیتے یا ان سے کہتے کہ وہ سڑک کے کناروں پر گڑھوں سے میلا، گندا پانی پی لیں۔ اس واقعے سے بھیم کو اندازہ ہوا کہ اچھوت ہونے کے کیا معنی ہوتے ہیں۔

ان کے معصوم ذہن پر ایک اور واقعہ کی چھاپ تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہ گئی۔ پیاس سے بے چین ہو کر بھیم نے چوری چھپے عام لوگوں کے لیے بنی ٹنکی سے پانی پی لیا۔ اونچی ذات کے لوگوں نے بھانپ لیا اور اس پر بری طرح پٹائی کی۔

بھیم روزانہ کوئی شرمناک اور بے عزتی والا تماشہ دیکھتے تھے۔ مقامی حجام جو گاؤں کی بھینسوں تک کے بال کاٹنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا تھا، اس نے بھیم راؤ کے سر کے بال کاٹنے سے اس لیے انکار کر دیا کہ انھیں چھونے سے وہ ناپاک ہو جائے گا چنانچہ بھیم کی بہن ان کے سر کے بال کاٹا کرتی تھیں، جس میں بیچ میں گول بالوں کا گچھا چھوڑ دیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ چھوٹی سی چوٹی ہوتی تھی۔

چھوٹی عمر میں ہی بھیم کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ اچھوت برادری صدیوں سے اسی طرح اونچی ذات والوں کے ہاتھوں بے عزتی اور نامرادی کا شکار ہوتی رہی تھی۔

## تعلیم

بھیم راؤ درمیانی درجے کے طالب علم تھے۔ وہ اپنی تعلیم پر زیادہ دھیان نہیں دے پا رہے تھے۔ ان کو باغبانی کا شوق تھا۔ وہ پودے خریدتے اور پوری محنت سے انھیں لگاتے اور بڑھتے دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔

چوتھی جماعت میں انھیں ایک زبان اور پڑھنی تھی۔ وہ سنسکرت پڑھنا چاہتے تھے مگر ان کے استاد نے انھیں سنسکرت پڑھانے سے قطعاً انکار کر دیا۔ دکھے دل سے انھوں نے فارسی لے لی۔

بھیم پڑھنے میں دلچسپی لینے لگے مگر درسی کتابوں کے علاوہ غیر درسی کتابوں میں ان کو زیادہ دلچسپی تھی۔ اچھوت ہونے کی وجہ سے عام کتابیں بھی انھیں مشکل سے ملتی تھیں۔ ایک ہی طریقہ تھا کہ ان کو خریدا جائے۔ مگر رام جی بھیم کو غیر درسی کتابیں پڑھتے دیکھ کر خوش نہیں تھے، لیکن جب کتابوں کی خرید کا سوال ہوتا تو وہ انکار نہ کرتے، اگر پیسہ نہ ہوتا تو اپنی شادی شدہ کسی بیٹی کے پاس جاتے، اس کا ایک گہنا لیتے اور گروی رکھ کر رقم مہیا کرتے۔ اس طرح وہ بھیم کی کتابوں کا انتظام کرتے۔

ممبئی میں پریل میں وہ ایک کمرے میں ڈابک چال میں رہتے تھے۔ کمرہ گھریلو ساز و سامان سے بھرا تھا۔ ایک گوشے میں ایندھن کا ڈھیر تھا اور دوسرے میں چولھا تھا۔ یہ کمرہ سونے اور کھانے کے لیے یکساں طور پر استعال ہوتا تھا۔ ہر رات ایک بکری کو بھی اس کمرے میں بسیرا ملتا تھا۔

رام جی نے ایک طریقہ نکالا تا کہ بھیم بغیر کسی رکاوٹ کے مطالعہ کر سکیں۔ جب بھیم سوئے ہوتے تھے اور بکری ان کے پیروں کی طرف ہوتی تھی تو رام جی جاگتے رہتے تھے اور پھر آدھی رات کے بعد بھیم کو جگا دیتے، اس طرح وہ ایک یا دو گھنٹے پڑھتے۔

اس طرح انھوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی اور میٹریکولیشن کا امتحان 1907 میں پاس کر لیا۔ یہ ایک اچھوت کے لیے نادر کارنامہ تھا۔ ماہر ذات کے لوگوں نے ایک جلسہ کیا اور بھیم راؤ کو مبارک باد دی۔

جلد ہی رام جی نے 17 برس کے بھیم راؤ کی ایک 9 سالہ لڑکی رما بائی سے شادی کر دی۔ بائیکلا کے کھلے مارکیٹ شیڈ میں شادی کی رسم ادا کی گئی۔

## زبردست علم

بھیم راؤ نے ایلفنسٹن کالج میں داخل ہو کر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہاں بھی ماہر ہونے کی وجہ سے انھیں اذیتیں سہنی پڑیں۔ انھیں تکلیف ہوتی تھی کہ ہر طرف اچھوتوں سے اس طرح کا برتاؤ ہو رہا تھا، بہر طور کالج میں پڑھائی مکمل کی۔ اس کے بعد تعلیم رام جی کے مالی ذرائع سے باہر کی بات تھی۔ وہ آگے اعلیٰ تعلیم کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ خوش قسمتی سے مہاراجہ بڑودہ سیاجی راؤ نے امبیڈکر کو وظیفہ عطا کر دیا جس کی وجہ سے 1912 میں انھوں نے بی۔اے۔ پاس کیا۔

رام جی کا 2 رفروری 1913 کو انتقال ہوگیا۔ وہ باپ جس کی وجہ سے بھیم جی اس مرتبے کو پہنچے تھے، نہ رہے۔ خاندان کے خرچ کی تمام تر ذمے داری اب بھیم کے کندھوں پر آپڑی تھی۔

ایک بار پھر سیاجی راؤ، مہاراجہ بڑودہ نے ان کی مدد کی۔ سیاجی راؤ نے اعلیٰ تعلیم کے لیے ان کا انتخاب کیا اور انھیں امریکہ بھیج دیا، اس کے بدلے میں واپسی پر بھیم جی راؤ کو بڑودہ ریاست کی 10 سالوں تک خدمت کرنی تھی۔

جولائی 1913 میں بھیم راؤ نیویارک (امریکہ) پہنچے۔ یہاں انھوں نے حیرت انگیز طور پر سخت محنت کی۔ ان کا تہیہ تھا کہ نہ صرف انھیں یونیورسٹی ڈگری لینی ہے بلکہ معاشیات، سیاسیات، سماجی علوم، قانون، اخلاقیات اور سماجیات کے مضامین کا مطالعہ بھی کرنا ہے۔ انھوں نے، قدیم ہندوستان میں تجارت، کے عنوان پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھا اور 1915 میں ایم.اے. کی ڈگری لی۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے دوسرا تحقیقی مقالہ لکھا، ''ہندوستان کا قومی بیوپاری منافع (نیشنل ڈیویڈینڈ فار انڈیا) ایک تاریخی تجزیاتی مطالعہ'' جسے کولمبیا یونیورسٹی نے 1916 میں منظور کیا اور جب 8 سال بعد وہ چھپا تو یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری عطا کی۔

امریکہ میں پہلی بار انھوں نے محسوس کیا کہ برابری کیا ہوتی ہے۔ بھید بھاؤ اور اچھوت نہ مانے جانے سے آدمی کو کیا محسوس ہوتا ہے۔ انھوں نے نتیجہ نکالا کہ اگر ماہر کو اپنے اچھوت ہونے کے بدنما داغ کو مٹانا ہے تو تعلیم حاصل کرنی ہوگی۔

امریکہ سے وہ معاشیات اور سیاسیات کے مطالعے کے لیے لندن چلے گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کرتے بڑودہ ریاست نے ان کا وظیفہ منسوخ کردیا۔ مجبور ہوکر بھیم راؤ ہندوستان لوٹ آئے لیکن انھوں نے قسم کھائی کہ ایک بار وہ پھر واپس جائیں گے اور اپنی تعلیم پوری کریں گے۔

پڑھائی میں اس سخت محنت اور جانفشانی کے دوران ان کے مطالعے کا شوق برقرار رہا۔ نہایت کنجوسی کرکے وہ نئی نئی کتابیں خریدتے اور پڑھتے تھے۔ ان کے پاس تقریباً 2000 کتابوں کا ذخیرہ تھا۔

وہ ہندوستان لوٹ آئے اور معاہدہ کے مطابق بڑودہ جاکر نوکری کرلی مگر ایک غریب ماہر کی کون عزت کرتا، چاہے وہ کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو اور چاہے وہ مہاراجہ بڑودہ کا ملٹری سکریٹری ہی کیوں نہ ہو۔

ان کے ماتحت ان کے سامنے دور کھڑے ہوتے، کاغذات اور فائلیں بھی ان کی طرف پھینک دیتے۔ کوئی انھیں پینے کے لیے پانی تک نہ دیتا۔ انھیں رہنے کے لیے کوئی جگہ بھی نہ مل سکی۔ آخرکار اپنی ذات کا اظہار کیے بنا انھوں نے ایک پارسی ہوسٹل میں رہائش اختیار کرلی۔ لیکن جب انھیں بھی بھیم راؤ کی ذات کا علم ہوا تو انھیں فوراً نکال باہر کیا گیا۔ مہاراجہ کا دیوان بھی اس معاملے میں ان کی کچھ مدد نہ کرسکا۔ دل شکستہ بھیم راؤ ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر خوب روئے۔ اس کے بعد 1917 میں وہ ممبئی واپس آگئے۔ کچھ دن بعد ان کی سوتیلی ماں کا انتقال ہوگیا۔

انھوں نے ممبئی کے ایک کالج میں جز وقتی طور پر لیکچرار کی نوکری کرلی۔ مقصد تھا پیسہ کمانا اور لندن میں اپنی تعلیم پوری کرنا۔

اس وقت کولھاپور کے مہاراجہ شاہو مہاراج پچھڑی ذاتوں کی بھلائی میں بہت دلچسپی لے رہے تھے۔ انھوں نے اچھوت طلبہ کے لیے مفت تعلیم، مفت بورڈنگ کا انتظام کیا تھا۔ وہ ان کو ملازمتیں دیتے تھے اور ہر طرح سے ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ شاہو مہارج کی مدد سے بھیم راؤ نے چودہ روزہ رسالہ ''موک نایک'' (گونگوں کا رہنما) 31/جنوری 1920 کو جاری کیا۔ اس کا مقصد چھوا چھوت کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنا تھا اور ہندوؤں میں سے ذات پات کی دیواروں کو گرانا تھا۔ شاہو مہاراج نے اچھوتوں کی کئی سبھائیں، میٹنگیں بلائیں جن میں بھیم راؤ نے تقریریں کیں۔ انھوں نے ایک میٹنگ 21/مارچ 1920 جس کی صدارت امبیڈکر نے کی، اس میں شاہو مہاراج نے کہا، ''تمھیں اپنا نجات دہندہ بھیم راؤ کی صورت میں مل گیا ہے۔ میں یقین کرتا ہوں وہ ضرور بیڑیاں توڑ دے گا۔''

بھیم راؤ نے یقیناً اچھوتوں کی وہ بیڑیاں کاٹ ڈالنے کی مہم شروع کردی جنھوں نے اچھوتوں کو باندھ رکھا تھا۔

بہرحال سب سے پہلے جو کام کیا جانا تھا وہ لندن جانے کا تھا۔ 1920 میں جب ان کے پاس کافی رقم ہوگئی تو وہ لندن روانہ ہوگئے۔ اپنی تعلیم پوری کی اور ہندوستان لوٹے۔

بھیم راؤ اب بیرسٹر تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری لندن سے اور ڈاکٹر آف فلاسفی کی امریکہ سے لی۔

## کام شروع ہوتا ہے

اس سلسلے میں انھوں نے تعلیم کو اولیت دی اور اس کے لیے مفت اسکول کھولے جہاں بچے اور بڑے سب ہی پڑھ سکتے تھے۔ ریڈنگ روم اور لائبریریاں بنائیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے اچھوتوں کے مقدمات کی عدالتوں میں پیروی کی اور ان کے لیے انصاف حاصل کیا۔ جلد ہی وہ غریب اور پسماندہ لوگوں کے لیے باپ کی مانند مشہور ہوگئے۔ وہ ان کو بابا کہنے لگے یا پھر زیادہ تعظیم کے ساتھ بابا صاحب کہتے تھے۔ عام لوگ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کو ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کہہ کر پکارنے لگے۔

1929 میں سرکار نے ان کو ممبئی قانون ساز اسمبلی میں نامزد کیا تاکہ وہ پسماندہ طبقوں کے مفادات کی نگرانی کرسکیں۔

ممبئی قانون ساز کونسل میں بابا صاحب نے مضبوط موقف اختیار کیا۔ ان کی دلچسپی تعلیم، شراب بندی، ٹیکس، عورتوں اور بچوں کی بہبود اور پسماندہ ذاتوں کی ترقی میں تھی۔ 1928 میں انھوں نے ماہروں کی زندگی کے معیار کو بلند بنانے کے لیے ایک انقلابی بل رکھا۔ مروجہ قانون کے مطابق ایک ماہر سرکار کا چوبیس گھنٹے کا غلام ہوتا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں اس کے خاندان کے کسی فرد کو اس کی جگہ پر کام کرنا ہوتا تھا۔ اس لگاتار خدمت کے معاوضے میں اسے زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جس کو ''وٹن'' کہتے تھے، تھوڑا اناج اور کچھ بہت تھوڑی سی رقم بطورِ تنخواہ دی جاتی تھی۔ اس بل کے ذریعے بابا صاحب نے اس غلامی کو ختم کرنے کی کوشش کی

تھی۔ یہ بل کونسل کے ممبران کے عدم تعاون کی بنا پر پاس نہ ہوسکا۔ اس بل پر جرح کرتے وقت ڈاکٹر صاحب امبیڈکر کو کونسل میں سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

مارچ 1930 میں جس وقت گاندھی جی ڈانڈی مارچ پر تھے، جو کہ سول نافرمانی تحریک کی ابتدا تھی، ٹھیک اسی وقت دوسری طرف ڈاکٹر بابا صاحب ایک ستیہ گرہ کررہے تھے کہ مشہور رام مندر''ناسک'' میں اچھوتوں کے داخلے پر پابندی ہٹائی جائے۔

سائمن کمیشن کی سفارش پر برطانوی سرکار نے ہندوستان کے دیسی حکمرانوں اور مختلف پارٹیوں کے لیڈروں کو لندن میں ہونے والی گول میز کانفرنس میں 31 جنوری 1930 کو بلایا۔ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر نے اس کانفرنس میں اچھوتوں کی نمائندگی کی تھی۔

ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کو کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں بھی بلایا گیا۔ اس بار وہ فیڈرل اسٹرکچر کمیٹی کے رکن تھے جس کو مستقبل کے لیے ہندوستان کے دستور کا مسودہ تیار کرنا تھا۔ دوسرے اجلاس کی اہم بات مہاتما گاندھی کی اس میں شمولیت تھی۔

مسلسل جانفشانی نے آخر کار بابا صاحب کی صحت پر اپنا اثر دکھانا شروع کردیا۔ آرام کرنا ضروری ہوگیا۔ اس غرض کے لیے وہ مارچ 1934 میں بورڈی اور مہابلیشور چلے گئے۔

27 رمئی 1935 کو ان کی بیوی رما بائی کا مختصر سی بیماری کے بعد انتقال ہوگیا۔ باہمت ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر جنھوں نے نہ جانے اپنی زندگی میں کتنے تکلیف دہ حالات کا سامنا کیا تھا، اس سانحے سے ٹوٹ گئے۔

رما بائی کے انتقال سے پہلے بابا صاحب کو ممبئی سرکار نے''لا کالج'' کے پرنسپل کا عہدہ پیش کیا تھا جس کو انھوں نے قبول کرلیا تھا۔ انھوں نے جون 1935 میں وہاں کام شروع کردیا۔ وہ ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے جس میں جدید ترین سہولیات، سامان اور مانے ہوئے قابل استاد ہوں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے 1945 میں پیوپلز ایجوکیشنل سوسائٹی بنائی اور جون 1946 میں سدھارتھ کالج قائم کیا۔

15 جولائی 1947 کو برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان کی آزادی کا ایکٹ پاس کردیا۔ اب آزاد ہندوستان کو اپنی کابینہ بنانے کا حق حاصل ہوگیا۔ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کو وزیر قانون کے عہدے کے لیے بلایا گیا اور انھوں نے اسے قبول کرلیا۔ 15 راگست 1947 کو ہندوستان آزاد ہوگیا۔

## دستور ساز

آزاد ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی نے ایک دستور کا مسودہ تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی۔ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر اس کمیٹی کے صدر تھے۔

اپنی وزارت کا کام دیکھنے کے علاوہ ان کو دستور سازی کے کام میں بھی جوجھنا پڑ رہا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ملک بہت قدیم ہے، بہت مختلف اور بہت وسیع ہے۔ دستور میں ان سب باتوں کو ملحوظ رکھنا تھا۔ حالانکہ اس کمیٹی میں سات ممبر اور بھی تھے لیکن مختلف

وجوہات کی بنا پر دستور کے مسودے کی تیاری کا کام بہت حد تک ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کے کندھوں پر ہی تھا۔ چھ مہینے بعد فروری 1948 میں ان کا کام پورا ہو گیا۔

اتنی شدید دماغی اور جسمانی محنت نے اپنی قیمت وصول کرنی شروع کردی۔ ان کی صحت خراب ہونے لگی۔ ان کو گھنٹوں دماغی تکلیف رہتی تھی اور کبھی کبھی یہ ایک یا دو دن تک رہتا۔ وہ علاج کے لیے ممبئی آگئے۔ اپنی بیوی رمابائی کی وفات کے بعد وہ بالکل تنہا تھے، ان کا دکھ درد میں کوئی شریک نہ تھا۔ یہاں انھیں ایک ساتھی ڈاکٹر شاردا کبیر کی صورت میں مل گیا۔ یہ خاتون اس اسپتال میں ڈاکٹر تھیں جہاں وہ زیر علاج تھے۔ 15 اپریل 1948 کو 57 سال کی عمر میں انھوں نے دوسری شادی کرلی۔

صحت یاب ہونے اور نئی گھریلو زندگی پانے کے بعد وہ اپنے کام کی طرف لوٹ آئے۔ اکتوبر 1948 میں ان کی کتاب اچھوت (انگریزی میں) چھپی۔

دستور کا مسودہ عوام کے سامنے آیا اور ترمیم کے لیے چھ ماہ تک رہا۔ اس کے بعد ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر نے اسے دستور ساز اسمبلی میں پیش کیا۔ اس میں 8 ابواب اور 395 دفعات تھیں۔

دستور کو اسمبلی میں تین بار پڑھا گیا۔ اس کے 8 ابواب اور 395 دفعات 26/نومبر 1949 کو منظور کی گئیں۔ دستور کا اہم پہلو عوام کا اقتدار اعلیٰ ہے۔ پارلیمنٹ عوام کے نمائندہ کی حیثیت سے اس اقتدار کی حامل ہے۔

دستور کے مسودہ کی بڑی تیاری کے علاوہ ان کے پاس ہندو قانون کو نئے روپ میں ترتیب اور تحریری شکل دینے کا مشکل کام تھا۔ انھوں نے ''ہندو کوڈ بل'' دستور ساز اسمبلی کے سامنے اکتوبر 1948 میں رکھا لیکن اس صورت میں یہ بل پاس نہ ہوسکا۔

مایوس اور افسردہ ڈاکٹر امبیڈکر یہ صدمہ برداشت نہ کرسکے۔ انھوں نے وزیر قانون کے عہدے اور کابینہ سے استعفیٰ دے دیا۔

مئی 1955 سے ڈاکٹر امبیڈکر کی صحت میں تیز گراوٹ آرہی تھی۔ ان کے دانت ٹوٹ چکے تھے۔ اب انھیں اٹھنے اور چلنے میں بھی سہارے کی ضرورت تھی۔ ان کو سانس لینے میں دقت ہورہی تھی۔ اپنی گرتی صحت کے باوجود وہ گھنٹوں لکھنے کا کام کرتے۔ ان کی کتاب ''بدھ اور ان کا دھرم'' مکمل ہوئی۔ انھوں نے دو کتابیں، ''رؤلوشن اینڈ کاؤنٹر ریولوشن ان انڈیا'' اور ''بدھ اینڈ کارل مارکس''، لکھنی شروع کیں۔ مہاتما بدھ کے یوم پیدائش کی تقریب مئی 1956 میں انھوں نے اعلان کیا کہ وہ آنے والے اکتوبر میں بودھ ہوجائیں گے۔ 14/اکتوبر 1956 کو انھوں نے اپنی بیوی اور تین لاکھ لوگوں کے ساتھ بدھ مذہب قبول کرلیا۔

ایک ماہ بعد وہ کٹھمنڈو چوتھی بدھسٹ فیلوشپ کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے گئے۔ جب وہ ہندوستان لوٹے تو بری طرح تھک گئے تھے۔ پھر بھی انھوں نے اپنی کتاب ''بدھ اور کارل مارکس'' کا آخری باب لکھا۔

5/دسمبر 1956 کی رات ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر سونے کے لیے بستر پر گئے اور نیند ہی میں وفات پاگئے۔ بودھ کہتے ہیں انھیں نروان مل گیا۔

□□□

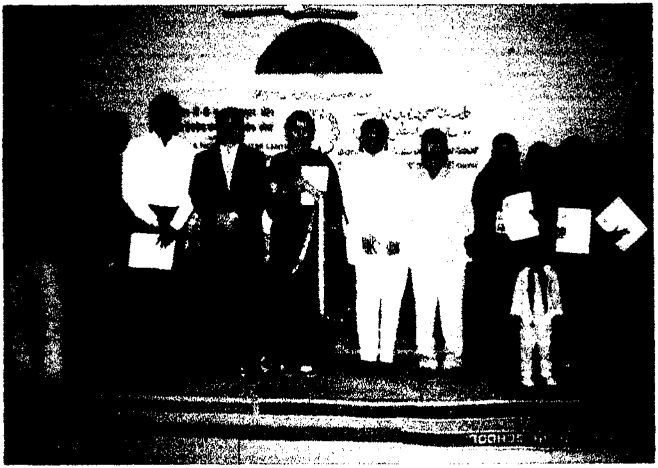

گذشتہ دنوں قومی اردو کونسل کی طرف سے حلیمہ ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ گلبرگہ کے زیر اہتمام چلائے جا رہے کمپیوٹر سینٹر کا جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں (بائیں سے) جناب امجد جاوید سکریٹری حلیمہ این جی پی یو ایل کمپیوٹر سینٹر، جناب خالد مامون، آئی جی پی کرناٹک محترمہ شائستہ یوسف، خازن آل انڈیا اردو منچ، بنگلور، پروفیسر ہاشم علی اور جناب وہاب عندلیب سابق صدر کرناٹک اردو اکادمی اور طلبہ وطالبات۔

قومی اردو کونسل نے اردو داں طبقے کو روزگار مرکوز تربیت دینے کے لیے پورے ملک میں 225 کمپیوٹر سینٹر قائم کیے ہیں جن میں سوا لمبن (نورد) اسکیم کے تحت 50 سینٹر خواتین کے لیے مخصوص ہیں۔ قومی اردو کونسل خواتین کو خود کفیل بنانے اور انھیں کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے واقف کرانے پر خاص توجہ دے رہی ہے۔ اب تک 22905 طالب علموں کو ڈپلوما دیا جا چکا ہے جس میں 10436 طالبات ہیں۔ ان میں سے 7148 طالب علموں (2727 طالبات) کو ملازمت حاصل ہو چکی ہے۔ اس کورس کی بدولت خواتین کی خود اعتمادی اور خود انحصاری میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ زیر نظر تصویر میں بچوں کا گھر کمپیوٹر سینٹر، دریا گنج، نئی دہلی کی طالبات کو کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔